سحر شب گذیدہ
محی الدین نواب

نواب سعد اللہ جان کی عالی شان کوٹھی رنگین قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ رات میں دن کا سماں تھا۔ نامی گرامی شعراً اور مشہور ادباء کے علاوہ علاقے کی معزز ہستیاں بھی محفلِ مشاعرہ میں تشریف لا رہی تھیں۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ نواب صاحب ہر ماہ کی آخری تاریخوں میں محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ شاعری نواب سعد اللہ جان کی کمزوری تھی۔ انہیں شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ حالانکہ وہ خود تو شعر نہیں کہتے تھے مگر شعر سننے اور سمجھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ ایسی محفلیں منعقد کرکے نہ صرف اپنے شوق کی تسکین کرتے تھے بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی روایت کو بھی قائم رکھے ہوئے تھے۔

غزل نے کوٹھی میں قدم رکھتے ہی محسوس کیا کہ وہ اندر سے ڈگمگا رہی ہے۔ اسے شعر گوئی کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ شوقیہ شاعری کرتے کرتے کچھ بہتر اشعار کہنے لگی تھی لیکن خوب سے خوب تر کے لئے اصلاح ضروری ہوتی ہے۔ پروین شاکر اس کی محبوب شاعرہ تھی۔ وہ اس کی طرح دنیا میں کمال حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن ادب کی کسی بھی صنف میں مکمل دسترس کے لئے بہترین استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک مخلص استاد کی تلاش میں سرگرداں رہی تھی۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے۔ اگر خدا نہ بھی ملے مگر منزل مل جائے تو خدا تک پہنچنے کی مسرتیں مل جاتی ہیں۔ ایک بار کسی شادی کی تقریب میں غزل نے اپنی چند سہیلیوں کے اصرار پر چند اشعار شرکائے محفل کی نذر کیے۔ سامعین میں مشہور شاعر ہمنوا بھی شریک تھے۔

انہوں نے پہلے ہی شعر میں اسے ٹوک دیا۔ ”بیٹی! یہ مصرع یوں نہیں یوں ہوگا۔“

وہ ٹھٹک کر جھینپنے لگی۔ انہوں نے حوصلہ دیا۔ ”تم عمدہ اشعار کہہ سکتی ہو۔ تمہیں جھجکنا نہیں چاہیے۔ پورا شعر سناؤ۔“

اس نے جھجکتے ہوئے سنایا۔

مدتوں سے پیاسی ہوں، تم مجھے سیراب کردو
میں ایک عام سا چہرہ ہوں، تم مجھے مہتاب کردو

انہوں نے کہا۔ "استعارے، کنایے اور تشبیہات کو سمجھو۔ بات کھل کر نہ کرو۔ پردے میں رکھ کر کہا کرو۔ مثلاً یہ شعر کچھ اس طرح ہوگا۔

خزاں رسیدہ چمن کو کبھی سیراب کردو
شبِ تاریک میں آؤ، مجھے ماہ تاب کر دو

اس اصلاح پر سب ہی واہ واہ کہہ کر داد دینے لگے۔ وہ ہمنوا صاحب کے سامنے دوزانو ہوگئی۔

سر کے آنچل کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میرے بے تکے شعر کو کتنے گہرے معنی پہنا دیئے ہیں۔ بے شک آپ استادِ کامل ہیں۔ میں آپ سے فیض حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کی سہیلی کے والد نے کہا۔ "محترم ہمنوا صاحب! میں غزل کی سفارش کرتا ہوں۔ آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھیں گے تو یہ ضرور ایک دن نامور شاعرہ تسلیم کی جائے گی۔"

ہمنوا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ایک نامی گرامی بزرگ شاعر نے اس کی اصلاح کی ذمے داری قبول کرلی۔

اسے ایسے لگا جیسے وہ موسلا دھار مسرتوں میں بھیگ رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب پورا ہونے والا تھا۔ اب وہ اپنے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے لاسکتی تھی۔ اپنے آپ کو منوا سکتی تھی۔

ڈولتی ہوئی کشتی کو کنارا مل گیا اور وہ شاعر ہمنوا کی شاگرد کی حیثیت سے پہچانی جانے لگی۔ یوں بے تکے اشعار کہنے والی ڈھنگ کے اشعار کہنے لگی۔

اس رات پہلی بار وہ اپنے استاد کے اصرار پر اس محفلِ مشاعرہ میں شرکت کر رہی تھی۔ وہاں تقریباً تمام ہی مشہور و معروف شعرائے کرام جمع تھے۔ وہ بڑی محتاط سی اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کے برابر ہمنوا بیٹھے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ یہ

خیال اسے پریشان کر رہا تھا کہ اس کے آس پاس تقریباً تمام شعرا اپنے ایک ایک شعر پر داد وصول کرنے والے تھے۔ پتا نہیں اسے کسی ایک شعر پر بھی داد ملے گی یا نہیں؟

نہایت ادبی ماحول تھا۔ کمرے میں اگربتیوں کی خوشبو نے فضا کو پاکیزہ بنایا ہوا تھا۔ قالین پر سفید براق چاندنی بچھی ہوئی تھی اور حاضرین کے آرام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔

شعرا کے درمیان ایک شمع دان میں ایک شمع رکھی ہوئی تھی جو کچھ دیر بعد روشن کی جانے والی تھی۔ تمام افراد کو نواب صاحب کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس شمعِ سخن کو روشن کرنے والے تھے۔

کمرے کی فضا میں دھیمی دھیمی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ غزل خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ہمنوا نے پہلی بار اس کی جس غزل کی اصلاح کی تھی۔ وہ آج وہی غزل سنانے والی تھی۔ وہ اپنے حوصلے کو سمیٹ کر اس طرح چپ بیٹھی تھی کہ اگر بولے گی تو بکھر جائے گی۔

انتظار ختم ہوا۔ نواب سعد اللہ جان اپنی باوقار اور جاذبِ نظر شخصیت سمیت کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے آتے ہی کمرے میں "آداب" کا ہلکا سا شور بلند ہوا۔ انہوں نے سب کے سلام اور آداب کا جواب دیتے ہوئے ایک ایک شاعر سے مصافحہ کیا۔ ان کے لبوں پر دبیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ زیادہ عمر گزر جانے کے باوجود وہ پُرکشش اور بااعتماد دکھائی دے رہے تھے۔ غزل انہیں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

نواب صاحب نے اسے دیکھتے ہوئے ہمنوا صاحب سے کہا۔ "ہم کسی تعارف کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ کی شاگرد آنسہ غزل صاحبہ ہیں۔ بقول آپ کے جنہیں جنون کی حد تک شعر کہنے کا شوق ہے۔"

ہمنوا بولے۔ "آپ نے درست فرمایا۔ میں آپ سے انہی کا غائبانہ تعارف کراتا رہا ہوں۔"

بھری محفل میں کسی کو سب سے پہلے اہمیت دی جائے تو فخر سے اس کی گردن تن جاتی ہے مگر وہ بُری طرح جھینپ رہی تھی۔ گردن جھکا کر چاندنی پر بکھری ہوئی گلاب کی پتیوں کو دیکھتی رہی تھی پھر ایک پتی کو اٹھا کر مسلنے لگی۔

تمام حاضرین محفل کی نگاہیں اس نوادر شاعرہ پر تھیں۔ وہ اس محفل میں تنہا صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ واقعی اگر کسی محفل میں یہ صنف نہ ہو تو وہ بے رنگ نظر آتی ہے اسی لئے تمام شرکا کی نظریں گھوم پھر کر اسی پر آکر ٹھہر جاتی تھیں۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں ایک کھلتا ہوا گلاب نظر آرہی تھی۔ اس کا مہتابی چہرہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔

نواب سعد اللہ جان بھی اس کے سادہ حسن کو اپنی نگاہوں سے چھو رہے تھے۔ ان کی نظریں غزل کی ستواں ناک پر ٹھہر گئیں۔ ناک کی لونگ ایک اشارے کی طرح چمک رہی تھی۔ تاریکی میں ایک ستارے کی طرح راستہ دکھا رہی تھی۔ سرد جذبوں کو ایک ننھے سے انگارے کی طرح گرما رہی تھی۔

انہیں فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ خلوت میں نہیں جلوت میں ہیں۔

انہوں نے کہا۔ "مشاعرے کا آغاز ہونا چاہیے۔ ہم آپ حضرات کی اجازت سے شمعِ سخن روشن کر رہے ہیں۔"

محفل میں رنگ بکھرنے کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے شمعِ سخن کو روشن کیا پھر کہا۔ "دستور کے مطابق نوآموز شاعر پہلے اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ ہماری آج کی محفل میں غزل صاحبہ نوآموز بھی ہیں اور مہمانِ خصوصی بھی۔ ہم شمعِ سخن ان کے آگے رکھتے ہوئے محفلِ مشاعرہ کا آغاز کرتے ہیں۔"

غزل کے پسینے چھوٹنے لگے۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اتنے نامی گرامی شعرأ کی موجودگی میں پہلے اس کی باری آئے گی۔ اگر اس کے استادِ گرامی ساتھ نہ ہوتے تو اس کے منہ سے تو شاید آواز ہی نہ نکلتی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا تو وہ بے ساختہ کہنے لگی۔ "مطلع عرض کرتی ہوں۔"

خزاں رسیدہ چمن کو کبھی سیراب کر دو
شبِ تاریک میں آؤ' مجھے ماہ تاب کر دو

اچانک ایک شور برپا ہوا۔ ہر طرف واہ واہ' بہت خوب' مکرر اور ارشاد کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے تو وہ گھبرائی' پھر یقین ہوا کہ توقع کے خلاف داد مل رہی ہے۔ اس نے پہلے شعر کو دوسری بار پڑھا پھر دوسرا شعر سنایا۔

صبا میں کھلتے ہوئے پھول کا جواب نہیں
کبھی مجھ کو چھو لو مجھے لاجواب کر دو

دوسرے شعر پر بھی اس نے خوب داد وصول کی۔ نواب صاحب اسے توجہ سے سن رہے تھے اور اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ اگرچہ اس کے اشعار میں عمر اور تجربات کے لحاظ سے پختگی نہیں تھی۔ اس کے باوجود شاعری کی ابتدا قابلِ تعریف تھی اس لئے سامعین میں بزرگ شعرأ بھی اسے داد دے رہے تھے۔

غزل نے اپنی غزل کا آخری شعر سنایا۔ "مقطع عرض کرتی ہوں۔"

تم غزل کو اپنی جاناں' خواب کم دکھاؤ
کبھی پیار سے پہن کر اسے کمخواب کر دو

اس آخری شعر پر بھی خوب واہ واہ ہونے لگی۔ شمعِ سخن دوسرے شاعر کے سامنے رکھی گئی۔ یکے بعد دیگرے شعرأ اپنا کلام سنانے لگے۔ نواب سعد اللہ جان انہیں سن رہے تھے اور رسمی داد دے رہے تھے۔ ہر شاعر اپنی غزل پیش کر رہا تھا۔ مگر پہلی بار جو غزل ان کی محفل میں آئی تھی' وہ ان کے اندر بڑی خاموشی سے گونج رہی تھی۔

یوں رات تقریباً دو بجے یہ رنگا رنگ محفلِ مشاعرہ اختتام پذیر ہوئی۔ تمام حاضرین محفل رخصت ہونے لگے غزل کے استادِ گرامی شاعر ہمنوا کو ملیر جانا تھا جبکہ اس کا گھر ناظم آباد میں تھا۔ ہمنوا نے اسے ناظم آباد جانے والی گاڑی میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔

اس گاڑی میں مرد حضرات بیٹھ رہے تھے۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ تنہا ان حضرات کے ساتھ کیسے سفر کرے گی۔

اچانک اس کے پیچھے نواب سعد اللہ جان کی سرگوشی ابھری۔ "سنئے۔"

وہ ذرا چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نواب سعد اللہ جان پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

وہ مسکرا کر بولے۔ "ہم کشمکش میں ہیں کہ آپ کو کیسے مخاطب کریں! آپ کہیں' جناب کہیں' یا تم کہہ کر مخاطب کریں؟"

وہ اپنے آنچل کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "جب سے یہاں آئی ہوں۔ آپ مجھے نہایت احترام سے مخاطب کرتے آرہے ہیں۔ آپ میرا نام لے سکتے ہیں یا پھر مجھے تم

کہہ کر بھی مخاطب کرسکتے ہیں۔"

"یعنی اگر ہم آپ کو آپ کے نام سے پکاریں یا تم سے کہہ کر مخاطب کریں تو آپ کو بُرا نہیں لگے گا؟ تو چلیئے آج سے ہم آپ کو تم کہہ کر پکاریں گے۔"

"آپ کچھ کہنا چاہتے تھے؟"

"آں.......... ہاں.......... ہم کہنا چاہتے تھے۔ تم مرد حضرات کے ساتھ سفر نہ کرو۔ رات کے دو بجے ہیں۔ کسی ٹیکسی یا رکشے میں تنہا سفر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ اگر بہتر سمجھو تو ہمارا ڈرائیور تمہیں گھر تک پہنچا دے گا؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میرا گھر ایک پسماندہ علاقے میں ہے۔ میں اتنی رات گئے آپ کی کار میں وہاں جاؤں گی تو محلے والے نہ جانے میرے متعلق کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔"

"درست کہتی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم اپنی گلی سے کچھ فاصلے پر اتر جاؤ؟"

"جی یہ مناسب رہے گا۔"

"فی الحال تو مہمان رخصت ہو رہے ہیں۔ ہمارا ڈرائیور بھی مصروف ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو ہم یہاں بیٹھ کر شعرو شاعری اور ادبِ عالیہ پر گفتگو کرسکتے ہیں۔"

وہ دونوں لان میں آکر کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ نواب سعد اللہ جان نے ایک نوکر کو بلا کر چائے کے لئے کہا پھر سر جھکا کر ہری ہری گھاس کو تکنے لگے۔ انہیں بیس سال پہلے کی وہ شام یاد آرہی تھی جب انہوں نے پہلی بار ماہ لقا سے ایک گارڈن میں ملاقات کی تھی۔ وہ اس کے سامنے خاموش بیٹھے رہے تھے۔ الفاظ کا ذخیرہ ہونے کے باوجود زبان سے کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ کچھ کہنا چاہتے تو انہیں ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ قوتِ گویائی سے محروم ہوگئے ہیں۔

آج بھی وہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ کہنے کو بہت کچھ تھا مگر جی چاہ رہا تھا کہ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی غزل کو خاموش نگاہوں سے پڑھتے جائیں۔ اس کے ایک ایک مصرع میں جو حسن پوشیدہ ہے اس کا تجزیہ کرتے جائیں۔

عورت کی تعریف کو غزل کہتے ہیں لیکن یہ غزل کہنے کے لئے انسان کا شاعر ہونا شرط نہیں بلکہ باذوق ہونا لازمی ہے۔ غزل اور سعد اللہ جان خاموشی سے ایک دوسرے کا

تجزیہ کر رہے تھے۔

سعد اللہ جان نے کہا۔ "تمہاری آنکھوں سے ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ تم بہت ذہین ہو۔ شاعری کے علاوہ کیا کرتی ہو؟"

غزل نے کہا۔ "فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں اور علاقے کے ایک اسکول میں ٹیچنگ بھی کرتی ہوں۔"

"بہت خوب.......... یعنی درس و تدریس سے منسلک ہو۔ شوقیہ طور پر ملازمت کرتی ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "جی.......... وہ دراصل میرے والد صاحب بیمار رہتے ہیں۔ بیماری کے باعث کوئی ملازمت نہیں کرسکتے اسی لئے میں کسی حد تک گھر کی ذمے داریاں سنبھالتی ہوں۔"

"اچھا تو گھر کی ذمے داری تمہارے کاندھوں پر ہے۔ کیا اس ملازمت سے اخراجات پورے ہوجاتے ہیں؟ ہمارا مطلب ہے کیا اس کے علاوہ بھی کوئی ذریعہ معاش ہے؟ تمہارا کوئی بھائی وغیرہ..........؟"

"ایک بڑے بھائی ہیں جو کہ شادی شدہ ہیں اور الگ رہتے ہیں۔ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہوں۔ ہم تین افراد ہیں کسی طرح گزارہ کرہی لیتے ہیں۔"

"گزارہ کرنا اور بات ہے مگر بہتر زندگی گزارنا تو سب کا حق ہے۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی پھر بولی۔ "بہتر زندگی! سہانے سپنے دیکھنا سب کا حق ہے۔ کوئی کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرسکتا مگر خواب صرف اس وقت تک اچھے لگتے ہیں، جب تک آنکھیں بند ہوں۔ میں جاگتی رہنا چاہتی ہوں اس لئے کم سوتی ہوں اور خواب نہیں دیکھتی۔"

"تم کوئی بہتر ملازمت بھی تو کرسکتی ہو۔ کسی آفس میں یا کسی فیکٹری میں۔ وہاں اسکولوں سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔"

"میں نے بہت سے دفتروں اور فیکٹریوں کی خاک چھانی ہے۔ وہاں تنخواہ زیادہ ہے تو ہوس پرست بھی زیادہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ لڑکیاں مجبور ہوکر آتی ہیں۔ مجھے مجبوری گوارا ہے اسی لئے پڑھے لکھے ماحول میں رہ کر عزت سے کما رہی ہوں۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ بہت محتاط رہنے کی عادی ہے۔ اپنے اشعار کی طرح خوابوں کی دہلیز پر بیٹھ کر آئیڈیل کا انتظار کرنے والی نہیں ہے۔

سعد اللہ جان ایک جہاندیدہ انسان تھے۔ اپنی ستر سالہ زندگی میں بہت سے تجربات سے گزر چکے تھے۔ جب سے انہوں نے ماہ لقا سے........ شادی کی تھی۔ تب سے آج تک کسی لڑکی کو میٹھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ ان کی ماہ لقا ایک آئیڈیل وائف تھیں۔ ماہ لقا نے سعد اللہ جان کو جتنا سمجھا تھا اتنا تو شاید وہ خود اپنے آپ کو نہیں سمجھتے ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی اور طرف مائل نہ ہوسکے تھے مگر آج دل کی دھڑکنیں ایسی ہو رہی تھیں جیسے ایک ضدی بچہ کھلونے کے لئے مچل رہا ہو۔

وہ بولے۔ ”لڑکیوں کے لئے عزت سے روزی حاصل کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ہماری ٹیکسٹائل ملز میں بہت سی ضرورت مند لڑکیاں اور خواتین ملازمت کے لئے آتی ہیں۔ ہم نے ان کی آسانی کے لئے مردوں اور خواتین کے لئے علیحدہ علیحدہ کیبنز بنا دیئے ہیں تاکہ کسی کو کسی سے شکایت نہ ہو۔“

انہوں نے یہ بات ایسے کہی تھی جیسے اپنے ٹارگٹ کی جانب پہلا پتھر پھینکا ہو۔ انہیں یقین تھا کہ یہ بات سن کر وہ ضرور متاثر ہوگی مگر ان کا اعتماد اس وقت ڈھوں ہوگیا جب غزل نے ان کی بات سننے کے بعد کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ اس کی خاموشی کو سمجھ نہ پائے۔ شاید وہ ان کی بات پر غور کر رہی تھی یا شاید اس نے ایک کان سے بات سنی تھی اور دوسرے کان سے نکال دی تھی۔

تمام مہمان جاچکے تھے اور گاڑیاں واپس آچکی تھیں۔ ڈرائیور بھی فارغ ہوچکا تھا۔ سعد اللہ جان نے اپنا وزیٹنگ کارڈ غزل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کبھی تمہیں کسی ملازمت کی ضرورت ہو تو بلا جھجک ہم سے رابطہ کرنا۔ انشاء اللہ تمہیں ہماری طرف سے مایوسی نہیں ہوگی۔“

غزل ان کے رویے اور نگاہوں کو پڑھ چکی تھی۔ وہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اکثر معمر مرد حضرات جوان اور کنواری لڑکیوں کو مرعوب کرنے کے لئے انہیں اپنی دولت سے متاثر کرتے ہیں مگر سعد اللہ جان نہایت محتاط انداز میں ایسا کر رہے

تھے اس لئے قابلِ برداشت تھے۔

غزل نے ان سے کارڈ لے کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر اسے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ کا ڈرائیور فارغ ہوگیا ہو تو پلیز! مجھے گھر پہنچا دیں۔ میرے والدین پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

سعد اللہ جان ان لمحات کو روک لینا چاہتے تھے مگر سمندر کی لہروں کو بہنے سے اور وقت کو گزرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انہوں نے ڈرائیور کو بلا کر کہا۔ ”انہیں گھر چھوڑ آؤ۔“

وہاں سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی تھی۔ وہ جانے لگی۔ چلتے وقت اپنا آنچل درست کر رہی تھی۔ اس کی چال میں بھی شاعری تھی۔ سعد اللہ جان اس کی سبک رفتاری کو دیکھتے رہ گئے۔ اس کی کمر اور کولہے جیسے غزل سناتے جارہے تھے۔ ایسی چال تھی جیسے قیامت کی چال چل رہی ہو۔

وہ اس لڑکی سے مل کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ برسوں بعد ان کے دل کے نہاں خانوں میں میٹھے میٹھے جذبات ابھرنے لگے مگر ان کی عمر ایسی نہیں تھی کہ وہ بے دھڑک ایسے جذبوں کا اظہار کر دیتے۔ غزل کے رویے نے سمجھا دیا تھا کہ جوانوں کی طرح پھسلیں گے تو گر جائیں گے۔ سنبھل سنبھل کر ہم سفری کا موقع حاصل کرنا ہوگا۔

وہ گھر پہنچی تو اس کے والدین جاگ رہے تھے۔ اس کے ابو کو پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا وہ ان سے بہت اٹیچڈ تھی۔ عموماً لڑکیاں ماؤں کے بجائے باپ سے زیادہ لگاوٹ محسوس کرتی ہیں۔ اسے بھی اپنے ابو سے زیادہ لگاؤ تھا اور جب سے وہ بیمار ہوئے تھے‘ اس نے ان کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ فارغ ہوتی تو فوراً ان کے پاس آجاتی کبھی ان کے بدن کو دابنے لگی تو کبھی سر اور پیروں کی تھکن دور کرنے کے لئے مساج کرتی رہتی۔ جب کبھی ان کی بیماری میں شدت آجاتی تو پریشان ہوجاتی۔

آج بھی وہ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ ماں سے پوچھا۔ ”ابو کو کھانے کے بعد دوا پلائی تھی؟“

”ہاں بیٹی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے کھانس رہے ہیں۔ اس وقت

تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔"

اس کی نظر بیڈ کے نیچے جلتے ہوئے کوائل پر پڑی۔ جسے مچھروں کو بھگانے کے لئے جلایا گیا تھا۔ اس کے دھوئیں کے سبب ہی کھانسی ہو رہی تھی۔ اس نے اسے بجھا دیا۔ کچھ دیر بعد کھانسی میں کمی ہوئی۔ وہ ان کے سر کو دابنے بیٹھ گئی۔

انہوں نے کہا۔ "اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ تم اب جاکر سو جاؤ۔ صبح ہونے والی ہے۔ آہ! تمہیں تو اسکول بھی جانا ہے۔ نیند کیسے پوری ہوگی؟ ساری رات مشاعرے میں گزار دی۔"

"آپ آرام سے سو جائیں۔ میں سو جاؤں گی۔ میں نے اسکول سے چھٹی لی ہے۔"

وہ کافی دیر تک اپنے ماں باپ کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ سعد اللہ جان کی کوٹھی اور محفل کا تذکرہ چلتا رہا پھر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

اس کی رائٹنگ ٹیبل پر ایک گفٹ اور اس کے برابر پھولوں کا خوبصورت بکے رکھا ہوا تھا۔ وہ اس تحفہ اور پھولوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ یکبارگی دل دھڑکنے لگا۔ کچھ تحفے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دل کی دھڑکنوں سے پہچان لئے جاتے ہیں۔

اس نے گفٹ پر رکھے کارڈ کو اٹھا کر پڑھا۔

"To Dear Gazal"

اس کی امی کمرے میں آکر بولیں۔ "سکندر آیا تھا۔ تمہارے ابو کی خیریت معلوم کرنے۔"

پھر انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے سے پیکٹ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکے کو کتنی بار منع کیا ہے' فضول خرچی نہ کیا کرے مگر وہ باز نہیں آتا۔ یہ دیکھو میرے لئے اور تمہارے ابو کے لئے سوٹ پیس لایا ہے۔"

غزل نے پیکٹ سے سوٹ نکال کر دیکھے۔

اس کی امی نے کہا۔ "وہ کچھ دنوں کے لئے لاہور جارہا ہے۔ کہہ رہا تھا' ایک ہفتے بعد واپس آجائے گا۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے مقدر پاس آکر پلٹ گیا ہو جیسے ایک بہت بڑی خوشخبری سنتے ہی اچانک آنکھ کھل گئی ہو۔ وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے اسے دیکھا

نہیں تھا۔ صرف محسوس کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔

غزل کی امی اسے سونے کی ہدایت دے کر چلی گئیں مگر نیند کس نامراد کو آنی تھی؟ وہ پریشان ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگی پھر اسے خیال آیا کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی بے تکے مذاق کرتا رہتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں صرف مجھے پریشان کرنے کے لئے اس نے یہ ڈرامہ پلے کیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ ذرا مطمئن ہوئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "نہ جانے وہ اپنا لاابالی پن کب چھوڑے گا؟ کب تک بچکانہ حرکتیں کرتا رہے گا؟ کسی معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اس کی ایسی ہی عادتیں مجھے ذہنی طور پر درہم برہم کر دیتی ہیں۔"

اس نے گفٹ کھولا۔ وہ ایک فریم شدہ تصویر تھی۔ پتا نہیں وہ کب اتاری گئی تھی؟ جس میں سکندر اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ وہ دونوں بے اختیار کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ بظاہر تو وہ ایک تصویر تھی لیکن درحقیقت وہ محبت کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ ایک انتہائی اہم لمحہ تھا جو تصویر کی صورت میں ریکارڈ ہو گیا تھا۔ محبت اور خوشی کے جذبے سے سرشار ہو کر غزل نے بے اختیار اسے چوم لیا۔ وہ اس دن کی یاد میں کھو گئی جب پہلی بار سکندر سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب وہ بے دھڑک اس کی زندگی میں بنا اجازت داخل ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

وہ گھر میں تنہا تھی اور کمرے میں بیٹھی ایک شعر موزوں کر رہی تھی۔ کال بیل کی آواز سن کر چونک گئی۔ مسلسل آواز آرہی تھی۔ کوئی بیل کے بٹن پر انگلی رکھ کر بھول گیا تھا یا پھر شرارت کی جارہی تھی۔

اس نے دروازے کے پاس آکر جھنجلاتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

گھنٹی کی آواز بند ہوئی۔ ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولئے' میں ہوں سکندر!"

اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ایک نوجوان دونوں ہاتھوں میں بھاری بھرکم بیگ اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ اسے پہچان نہیں پائی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔"

پھر وہ زبردستی دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ لوگوں کا یہی دستور ہے کہ مہمان دروازے پر ہی کھڑا رہے؟"

وہ گھور کر بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے تم اندر کیوں آ رہے ہو؟ اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہیں؟ کوا کاٹے گا۔ آپ جو موجود ہیں۔"

"میں کہتی ہوں باہر جاؤ۔ امی ابو نہیں ہیں۔ میں اکیلی ہوں۔"

"اللہ نے چاہا تو اب اکیلی نہیں رہیں گی۔ میں آ گیا ہوں۔"

وہ لاؤنج میں آ کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی آپ سے اپنا تعارف کرواتا ہوں لیکن پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم؟ کتنا لمبا سفر طے کر کے آیا ہوں؟ کیا ایک گلاس پانی مل سکے گا؟"

غزل اس کی بے باکی سے پریشان تھی۔ نہ جانے کون تھا؟ جو یوں گھر میں گھس آیا تھا۔ ویسے بھی چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں عام تھیں۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی کیا سوچیں گی کہ آتے ہی کام کروا رہا ہوں۔ دست خود' دہان خود۔ میں خود پی سکتا ہوں۔"

اس نے بڑی بے تکلفی سے فریج کھول کر ایک بوتل نکالی پھر اسے کھول کر منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پیتا چلا گیا۔ وہ پی چکا تو غزل نے پوچھا۔ "اب بتاؤ۔ تم کون ہو؟ اور کس سے ملنا ہے؟"

"کیا یونہی کھڑے کھڑے سوالات کرتی جائیں گی؟" وہ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آرام سے بیٹھ کر باتیں کیجئے۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے۔"

وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے مہمان وہ نہیں غزل ہے۔ وہ جھنجلا کر بولی۔ "تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں چیخوں گی تو محلے والے آ جائیں گے۔"

"سنا تھا کہ کراچی کے لوگ بڑے بے مروت ہوتے ہیں مگر مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"ہمارے ہاں مہمانوں کو عزت دی جاتی ہے۔ بن بلائے مہمان کو باہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔"

"آپ ایک شریف اور مہذب شخص سے کیسی نازیبا گفتگو کر رہی ہیں؟"

"تم شریف ہو تو شرافت سے بتاؤ۔ کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"ویسے تو میں منظور انکل کے گھر آیا تھا مگر مجھے لگ رہا ہے غلطی سے کسی پاگل خانے پہنچ گیا ہوں؟"

"یہ پاگل خانہ ہے تو یہاں کیوں آئے ہو؟"

"آپ کے ابو سے ملنے.........."

"تم میرے ابو کو جانتے ہو؟"

"آپ کے ابو مجھے جانتے ہیں' چونکہ وہ مجھے جانتے ہیں اس لئے میں بھی انہیں جانتا ہوں۔ بائی داوے آپ بہت خوبصورت ہیں۔ میں آپ کو پرپوز کرتا ہوں۔"

اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اس نے کتنی بے باکی سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی؟

"یہ.......... یہ کیا بے ہودگی ہے؟ میں کہتی ہوں.........."

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "لڑکیوں کو جو بھی کہنا ہوتا ہے شادی کے بعد کہتی ہیں۔ شادی سے پہلے صرف لڑکے بولتے ہیں اور اس میں بے ہودگی کی کیا بات ہے؟ کیا کراچی میں رشتہ مانگنا بے ہودگی ہے؟"

"تم کس قسم کے انسان ہو؟ جب سے آئے ہو اول فول بکتے جا رہے ہو۔"

"میں ایک خاموش طبع انسان ہوں۔ آپ سوال کر رہی ہیں تو میں جواب دے رہا ہوں ورنہ میں زیادہ بولتا نہیں ہوں۔"

وہ غصے سے اسے گھور رہی تھی۔ گھر میں کیا چیز آ گئی تھی؟ بڑا ڈھیٹ تھا۔ لاحول پڑھنے سے بھی جانے والا نہیں تھا۔

وہ بولی۔ "تم یوں باز نہیں آؤ گے۔ لگتا ہے مجھے کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔"

وہ غزل کی بات سن کر غور سے اس کے دونوں پیروں کو دیکھنے لگا۔

غزل نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ.......... یہ تم میرے پیروں کو کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"میں دیکھ رہا ہوں' آپ کی کون سی ٹانگ آرٹی فیشل ہے؟"

"کیا مطلب..........؟"

"بھئی آپ ہی نے تو کہا ہے کہ آپ کوئی سخت قدم اٹھانے والی ہیں۔ دونوں میں

سے ضرور کوئی ایک ٹانگ لکڑی کی ہوگی۔ ویسے میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسی خوبصورت لڑکی کسی ایک ٹانگ سے محروم ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ میری دونوں ٹانگیں سلامت ہیں۔“

”واقعی.........؟ شکر ہے کہ یہ میری غلط فہمی تھی ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ ایک لنگڑی بیوی کے ساتھ چلتا ہوا میں کیسا لگوں گا؟“

”اور اب میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تم یہاں سے اپاہج ہو کر جاتے ہوئے کیسے لگو گے؟“

یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگی۔ وہ بھانپ گیا کہ اسے مارنے کے لئے کوئی ڈنڈا وغیرہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔

اس نے کہا۔ ”میں آپ کے نیک ارادے سمجھ رہا ہوں۔ اب میری عافیت اسی میں ہے کہ میں آپ کو اپنی حقیقت سے آگاہ کردوں۔“

اس نے اپنی تلاش روک دی۔ وہ بولنے لگا۔ ”میں آپ کے ابو کے دوست ملک افتخار احمد کا بیٹا ہوں اور لاہور سے آیا ہوں۔“

اس نے پہلی بار سنجیدگی سے بات کی۔ غزل اسے توجہ سے سننے لگی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ ابو اکثر ملک افتخار صاحب کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوبار ان سے ملنے لاہور بھی گئے تھے۔

”مجھے سکندر کہتے ہیں اور میں ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ لاہور میں جہاں جاب کرتا ہوں وہ مجھے زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کرسکے‘ اس لئے میرا ٹرانسفر وہاں سے یہاں کر دیا گیا ہے۔“

وہ اپنی روداد سنا رہا تھا۔ غزل نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ وہ دیکھنے میں تعلیم یافتہ اور کسی اچھی فیملی کا فرد دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”عربی زبان سمجھ میں نہیں آتی‘ پھر بھی تلاوت کے وقت چپ رہتے ہیں۔ میں تلاوت نہیں فرما رہا ہوں۔ اپنا تعارف پیش کر رہا ہوں اور آپ نے سر پر آنچل رکھ لیا ہے۔ اپنے بارے میں تو کچھ بولیں۔ چلیں میں بتاتا ہوں۔ آپ کا نام غزل ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کا بھی شوق رکھتی ہیں۔ بیوٹیشن کا کورس

کیا ہے اور بہت کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ پتا نہیں وہ بہت کچھ کیا ہے؟ بہرحال جب چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی۔“

وہ ایک ہی سانس میں غزل کی ہسٹری سنانے بیٹھ گیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دکھ رہی تھی۔ عجیب شخص ہے؟ بولتا ہی چلا جا رہا ہے۔ وہ اس کے بارے میں اتنا سب کچھ جانتا ہوگا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

اس نے ذرا ٹھہر کر پوچھا۔ ”کیا میں نے غلط کہا؟“

وہ اس کے سوال پر چونکتے ہوئے بولی۔ ”نہیں.........بالکل نہیں۔“

”تو پھر اسی خوشی میں ایک کپ چائے پلا دیجئے۔ ویسے مجھے چائے بنانی آتی ہے۔ آپ کہیں تو یہ کام بھی میں خود انجام دے سکتا ہوں۔“

وہ سوچنے لگی۔ ”کیسا بے تکلف ہے؟ ہر بات آسانی سے کہہ جاتا ہے مگر اتنی بے تکلفی کے باوجود بھی باوقار دکھائی دے رہا ہے۔“

وہ اسے سوچتا دیکھ کر بولا۔ ”میرے بارے میں زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر میں جو بھی ہے‘ بس وہی چائے کے ساتھ لے آیئے کیونکہ کچھ دیر بعد کھانے کا وقت ہوجائے گا اس لئے ذرا ہلکا پھلکا ناشتہ کرنا چاہوں گا۔“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”آپ افتخار انکل کے بیٹے ہونے کے باوجود میرے لئے غیر ہیں۔ ایسا کریں کہ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں‘ میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ پلٹ کر باہر دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”ایسا کرتی ہوں کہ زینت آنٹی کو بلا کر لے آتی ہوں۔ کوئی بڑا ساتھ رہے گا تو ڈھارس رہے گی۔ شام تک امی اور ابو دونوں ہی آجائیں گے۔“ وہ مطمئن ہو کر دروازے سے باہر چلی گئی۔

سکندر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہ چاروں طرف ٹہل کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مختصر سا سامان تھا مگر بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ ”نہ جانے کہاں چلی گئی ہے؟“ سکندر کو اسے تنگ کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بہت شریر تھا۔ نئی نئی شرارتیں کر کے دوسروں کو پریشان کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اب جب کہ وہ پچیس سال کا بھرپور جوان ہو چکا تھا اور پریکٹیکل لائف گزار رہا تھا تب بھی اس کی شرارتوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ لاپروائی اور

لاابالی پن کے بغیر رہ نہیں پاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد غزل ایک معمر خاتون کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے ان سے سکندر کا تعارف کرایا۔ "یہ ہیں ملک سکندر احمد ابو کے دوست کے بیٹے!"

پھر سکندر سے بولی۔ "یہ زینت آنٹی ہیں۔ ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں۔"

سکندر نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ وہ ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود کچن میں آگئی۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ آنٹی کو بطور سکیورٹی گارڈ لایا گیا ہے۔ وہ غزل کی احتیاطی تدبیر پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

غزل چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ اپنی عادت کے مطابق بے تکان بولے جا رہا تھا۔ نہ جانے اس نے ایسا کیا کہا تھا کہ آنٹی اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ پا رہی تھی۔ وہ ٹرے رکھ کر جانے لگی۔

آنٹی نے کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ یہاں بیٹھو۔ دیکھو سکندر کتنے مزے کی گفتگو کر رہا ہے؟"

وہ انکار نہ کر سکی۔ انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ وہ آنٹی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ سکندر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا اسے شرارتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ سنجیدگی سے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ سکندر نے زینب آنٹی سے پوچھا۔ "آنٹی! آپ نے کبھی کسی نجومی کو اپنا ہاتھ دکھایا ہے؟"

"میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی کہ ہاتھ کی لکیروں سے انسانی زندگی کا کوئی تعلق ہے۔"

"مگر میں تو یقین رکھتا ہوں۔ ایک نجومی نے مجھے بتایا تھا کہ مستقبل میں تم ایک ایسی غزل پڑھو گے جسے کسی نے تحریر نہیں کیا ہو گا اور اس نے جیسا کہا تھا ویسا ہی ہونے والا ہے۔"

غزل نے اسے گھور کر دیکھا۔ آنٹی کچھ بولنا چاہتی تھی کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

وہ دروازہ کھولنے باہر آئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔" باہر سے اس کی امی کی آواز سنائی دی۔

اس نے ان کی آواز سن کر فوراً دروازہ کھولا۔ وہ ان کی بے وقت آمد پر حیران بھی تھی اور خوش بھی۔ "اتنی جلدی واپس کیسے آگئیں؟"

وہ اپنے بیٹے اور بہو کے گھر گئی تھیں۔ وہ جب کبھی وہاں جاتیں تو پورا دن گزارے بغیر واپس نہیں آتی تھیں مگر آج خلافِ توقع جلد آگئی تھیں۔

انہوں نے کہا۔ "وہاں پہنچی تو گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پڑوس میں بیٹھ کر انتظار کیا پھر واپس آگئی۔"

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی لاؤنج میں آئیں۔ انہیں ڈرائنگ روم سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

انہوں نے غزل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ "اندر کون ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ انہیں کچھ بتاتی۔ وہ خود ہی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ وہاں زینب آنٹی کے ساتھ ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

سکندر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے زینب آنٹی کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ "آپ یقیناً شیریں آنٹی ہیں۔"

انہوں نے چونک کر سکندر کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ "میں منظور انکل کے دوست ملک افتخار احمد کا بیٹا سکندر احمد ہوں اور لاہور سے آیا ہوں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "اچھا تو تم افتخار کے بیٹے ہو۔ بیٹھو بیٹھو۔"

وہ اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ زینب آنٹی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "غزل گھر میں اکیلی تھی اس لئے مجھے بلا کر لے آئی تھی۔ اب تم آگئی ہو۔ میں چلتی ہوں۔"

وہ چلی گئیں تو سکندر غزل کی امی سے مخاطب ہوا۔ "دراصل میرا ٹرانسفر یہاں ہو گیا ہے۔ اب مجھے کراچی میں ہی رہائش اختیار کرنی ہے۔ فی الحال میں یہاں کے راستوں سے انجان ہوں اس لئے مجھے انکل کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ڈیڈی نے چلتے وقت مجھے ہدایت کی تھی کہ کرائے کے مکان یا کسی کمرے وغیرہ کے لئے انکل سے رابطہ کروں۔"

"کرائے کے مکان کی کیا ضرورت ہے؟ تم ایک ہی تو فرد ہو۔ ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔"

"نہیں آنٹی! یہ مناسب نہیں ہوگا۔ کوئی ایک دو ہفتے کی بات تو ہے نہیں۔ میں کب تک آپ کے سروں پر نازل رہوں گا۔"

"کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو؟ چلو مستقل نہ سہی جب تک تمہیں کرائے کا کمرہ یا مکان نہیں مل جاتا۔ تب تک تو رہ سکتے ہو؟"

"میں تو آپ لوگوں سے ملنے اور مکان کے سلسلے میں آیا تھا۔ میرا ارادہ تو ہوٹل میں.........."

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ "بس.......... میں نے کہہ دیا۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ جب تک جی چاہے یہاں رہ سکتے ہو اور خبردار.......... ہوٹل کا نام نہ لینا۔"

وہ ہتھیار ڈالنے کے انداز میں بولا۔ "چلئے! جیسی آپ کی مرضی۔"

غزل کچن میں مصروف تھی اور اس دوران میں وہ ان دونوں کی گفتگو بھی سن رہی تھی۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ایک بڑا بھائی تھا جو شادی شدہ تھا۔ اس لئے تنہا رہنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اب یہ سن کر پریشان ہو رہی تھی کہ سکندر یہاں رہے گا۔

پریشانی یہ تھی کہ کسی غیر کی موجودگی میں گھر کے اندر ملنے والی آزادی ختم ہو جائے گی۔ اکیلے میں وہ دوپٹہ ایک طرف پھینک دیتی تھی۔ جہاں مرضی ہو بیٹھ جاتی تھی یا لیٹ جاتی تھی مگر اب تو دوپٹے کو ڈھال کی طرح لپیٹ کر رہنا ہوگا ایسے بن بلائے مہمان بوجھ لگنے لگتے ہیں۔

وہ شاعرانہ مزاج کی حامل تھی۔ خیالوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ کبھی کوئی شعر موزوں کرنے کے لئے گنگناتی رہتی تھی' پھول کے مہکنے اور بلبل کے چہکنے پر پابندی لگ رہی تھی۔

وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل کے اطراف کھانے میں مصروف تھے۔ سکندر چور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں دیکھ رہی تھی مگر دیکھ رہی تھی۔ ایسے وقت لڑکیاں آنکھوں سے نہیں دیکھتیں بلکہ ان کی چھٹی حس پرائی نظروں کی آنچ محسوس کرتی رہتی ہے۔

وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "آپ بہت کم بولتی ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ کم بولنا عقل مندی کی نشانی ہے مگر حد سے زیادہ خاموشی حماقت کی دلیل ہے۔"

"بے تکلفی زیادہ بولنے پر اُکساتی ہے اور میرا خیال ہے میں آپ سے فرینک نہیں ہوں۔"

"بات کرنے سے ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں کا پتا نہیں چلتا ہے؟ کیوں آنٹی! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

انہوں نے مسکرا کر تائید کی۔

"ویسے آنٹی! کچھ لوگ خاموش رہ کر خود کو دانشور ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ تو کھانا بھی خاموشی سے نہیں کھاتا تھا۔ گھڑی کے الارم کی طرح بجتا ہی رہتا تھا۔

غزل کھانے سے فارغ ہونے کے بعد برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔

سکندر بھی برتن لے کر اس کے پیچھے پیچھے وہاں آگیا۔ وہ جلدی سے اپنا آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ "ارے.......... آپ نے زحمت کیوں کی؟ میں ابھی آ رہی تھی۔"

"کیا میں آپ کو مولانا دکھائی دیتا ہوں' مجھے دیکھتے ہی اپنا آنچل سر پر رکھ لیتی ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ لڑکی جسے اپنا کہتی ہے اس کے سامنے حیا سے آنچل سنبھالتی ہے۔"

اس نے گھور کر اسے دیکھا۔ اب وہ کیا کہتی کچھ نہ کہنا ہی بہتر تھا۔ وہ بولنے پر اُکسا رہا تھا اور وہ اس کے ارادوں کو خوب سمجھ رہی تھی۔

میزبان کے خاموش رہنے سے مہمان کو یہی گماں ہوتا ہے کہ اس کا آنا باعثِ زحمت بن چکا ہے۔

وہ اسے چپ دیکھ کر بولا۔ "میرا خیال ہے۔ مجھے کوئی بہانہ کرکے یہاں سے چلا جانا چاہئے۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ وہ مجبور ہو کر بولی۔ "کیا آپ نے قسم کھائی ہے کہ مجھے بولنے پر مجبور کرکے ہی رہیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے' کتنا ترنم ہے آپ کی آواز میں۔ اب یاد آیا آپ شاعرہ ہیں۔ گنگناتی ضرور ہوں گی۔ آپ کی آواز کو یہ غنایت شاعری نے بخشی

ہے۔"

اس کے خوش الحان ہونے کی ایسی تعریف تھی کہ وہ اندر ہی اندر چوری چوری خوش ہوگئی لیکن تیور وہی تھے۔ یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوجانے والی لڑکی ہے۔

سکندر اس کے لئے بند کتاب کی مانند تھا۔ کتاب کو پڑھے بغیر اس کے سرورق سے اس کے معیاری ہونے کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

کمرے سے اس کی امی نے سکندر کو آواز دی۔ وہ چلا گیا۔ وہ جتنی تیزی سے بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ وہ اتنی ہی محتاط ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے اپنی ایک سہیلی عارفہ کی مثال تھی۔ وہ ایک نوجوان سے متاثر ہوئی پھر اس کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ یہ سلسلہ تقریباً سال بھر رہا پھر وہ نوجوان تھالی کے بینگن کی طرح دوسری طرف لڑھک گیا۔

اس کے محلے میں بھی ایک لڑکی کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ کسی نوجوان کے عشق میں مبتلا ہوکر اس سے شادی کرنے کے خواب دیکھتی رہی پھر جب کنواری ماں بننے لگی تو وہ عاشق محلہ ہی چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس نے کہانیوں میں بھی ایسے غیر سنجیدہ اور لاابالی فطرت کے نوجوانوں کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہ جلدی فیصلے کرنے اور انہیں جلد ہی بدل دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کی طرح پیار میں ڈوب جانے والے جذبوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ پیاسے آتے ہیں۔ کنویں سے پانی نکالتے ہیں' پیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

وہ جب شعر کہتی تو اس کے خیالوں میں بھی ایک آئیڈیل ہوتا تھا۔ کسی کو چاہنے کی اور کسی سے چاہے جانے کی تمنا کسے نہیں ہوتی؟ اس کے دل میں بھی یہ ارمان تھے۔ اگر وہ اپنے اندر ڈوب کر پوچھتی تو اسے جواب ملتا۔ "یہ مہمان اچھا لگا ہے۔" ایسی تیزی سے دھاوا بولنے والے جانے کیوں اچھے لگنے لگتے ہیں۔ ابھی وہ شعوری طور پر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہی تھی۔

اسے عمر رسیدہ لوگ اچھے لگتے تھے۔ بڑے معزز بڑے باوقار لگتے تھے۔ زندگی کی کڑی دھوپ سے گزرنے والوں کی گفتگو بہت سلجھی ہوئی اور بہت گہری ہوتی ہے۔ ان سے مل کر یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ زندگی کو کس طریقے اور کتنے سلیقے سے گزارنا چاہئے۔

سکندر جانتا تھا کہ پانی مسلسل گرتا ہے تو پتھر میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے اور وہ تو پھر ایک لڑکی تھی اور لڑکیوں سے زیادہ کوئی شے لچک دار نہیں ہوتی۔

اس نے غزل کی امی سے پوچھا۔ "انکل کس وقت تک آتے ہیں؟"

"وہ تقریباً نو سوا نو بجے تک آجاتے ہیں۔ ان کی طبیعت بھی آج کل کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ اکثر کھانسی کا دورہ پڑنے لگتا ہے۔ علاج بھی جاری ہے۔"

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کیا کہیں گے؟ بس دواؤں پر دوائیں بدلتے رہتے ہیں۔"

غزل چائے لے کر کمرے میں آئی۔ وہ اپنے ابو کی بیماری کی وجہ سے کافی پریشان رہتی تھی۔ اسے دکھ ہوتا تھا کہ وہ اس حالت میں بھی ڈیوٹی پر جاتے ہیں۔ وہ بڑھاپے میں انہیں آرام پہنچانا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ ابو کے بجائے وہ ملازمت کرے۔ اس عمر میں بیٹے ہی والدین کا سہارا بنتے ہیں مگر ان کا بیٹا تو شادی کے بعد علیحدہ رہنے لگا تھا اور مہنگائی کے اس دور میں وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال لے تو وہی بہت تھا۔ اس کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ ان تینوں کا خرچ بھی برداشت کرسکتا۔ اس لئے انہوں نے کبھی اس سے شکایت بھی نہیں کی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے ذہن پر پہلے ہی اپنے ابو کی بیماری اور فکر معاش کا بوجھ تھا۔ دوسری طرف سکندر کی موجودگی نے اسے پریشان کیا ہوا تھا مگر یہ پریشانی اسے اچھی لگ رہی تھی۔

گھریلو مسائل کتنے ہی گھمبیر کیوں نہ ہوں لیکن کسی کی میٹھی میٹھی باتیں دماغ پر بوجھ ہونے کے باوجود سکون بخشتی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا مگر جانے کیوں؟ وہ اقرار کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جب کوئی ان کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ دامن بچاتی ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ رومانٹک نہیں ہیں۔ پیار کے جذبوں سے عاری ہیں' لیکن تنہائی میں اپنے اندر چھپے ہوئے جذبوں کو جھانک کر دیکھتی رہتی ہیں اور دور خیالوں میں بھٹکتی رہتی ہیں۔

دروازے کھڑکیاں بند کرنے کے باوجود وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے گھر میں

اور اس کی زندگی میں گھسا چلا آرہا تھا اور اس کا یہ انداز غزل کو حواس باختہ کر رہا تھا۔

☆------☆------☆

وہ غسل خانے میں کپڑے دھو رہی تھی۔ ایسے میں وہ دوپٹہ اتار دیا کرتی تھی مگر جب سے سکندر آیا تھا۔ اسے کام کاج کے وقت بھی دوپٹے کو لپیٹ کر رہنا پڑتا تھا۔ بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مہمان بلائے جان بھی تھا اور کچھ کچھ جان سے قریب بھی ہو رہا تھا۔

وہ کپڑے دھوتے دھوتے دھیمی آواز میں گنگنانے لگی۔

"ضعف ہے یا خوشی ہے منزل کی
پاؤں کیوں ڈگمگائے جاتے ہیں
اف یہ محویتِ خیال کا حسن
جیسے پہلو میں آئے جاتے ہیں۔"

معاملاتِ دل کے مطابق ہی کوئی گیت یا غزل اندر سے ہمکتی ہے۔ وہ جیسے ڈوب گئی تھی کہہ نہیں سکتی تھی کہ کام کی دُھن میں ہے یا حُسنِ خیال کی محویت ہے۔

ماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "بیٹی' میں چھت پر جا رہی ہوں۔ کپڑے لے آؤ۔ میں نچوڑ کر دھوپ میں ڈال دوں گی۔"

"آپ چلیں میں آرہی ہوں۔"

وہ نلکے کو پوری طرح کھول کر صابن لگے ہوئے کپڑوں کو کھنگالنے لگی۔ اس علاقے میں ہر دو دن بعد پانی آیا کرتا تھا۔ وہ ضرورت کے مطابق پانی کا ذخیرہ کرنے کے بعد تمام میلے کپڑے دھو کر غسل کیا کرتی تھی۔ حکومت نے روٹی تو مہنگی کر ہی دی تھی۔ پانی بھی ترسا ترسا کر دیتی تھی۔

وہ کپڑوں کی بالٹی اٹھا کر لے جانے لگی تو اس کا آنچل دروازے سے نکلی ہوئی کیل میں پھنس گیا۔ اسے خبر نہ ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔ دوپٹہ کیل میں اٹکنے کی وجہ سے اس کے جسم سے سرک کر فرش پر آگیا۔

سامنے سے سکندر آرہا تھا۔ اس نے پہلی بار غزل کو یوں دیکھا تھا۔ کپڑے دھونے کے باعث وہ کہیں کہیں سے بھیگی ہوئی تھی۔ گیلے کپڑے بدن سے چپک کر کہہ رہے تھے کہ ہم تیرے ہوگئے۔ سکندر کی نظریں کہہ رہی تھیں۔ "ساری دنیا بجھ گئی۔ بس تُو ہی رہ

گئی ہے۔" حجاب منکر ہوگیا تھا۔ بے حجابی امنڈ آئی تھی۔ غزل نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھوں کو قینچی بنا کر سینے پر ڈھال کی طرح رکھ لیا۔ وہ پلٹ کر دوپٹہ اٹھانے کے لئے بڑھی۔ اس سے پہلے سکندر نے اسے اٹھا لیا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ یوں لگا جیسے دوپٹہ اس کے ہاتھ میں نہیں آیا ہو بلکہ وہ خود اس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یوں بے پردہ ہونے کے باعث اس کے رخساروں پر انار پھوٹ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے؟

وہ منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ پھر سکندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "پلیز! دوپٹہ دیں۔"

وہ سمجھ رہی تھی کہ منہ پھیرنے سے محفوظ ہوگئی ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ حسنِ نظر رکھنے والے ہر زاویے میں خوبصورتی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ سامنے سے جتنی دلکش تھی۔ پیچھے سے اتنی ہی دل آویز تھی۔

تصویر کا ایک رخ پلٹ گیا تھا۔ دوسرا رخ نگاہوں کے سامنے تھا۔ سکندر بڑی محویت سے اس کی پتلی کمر اور ابھرے ہوئے کولہوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ حیا کا مجسمہ بنی کھڑی تھی اور وہ سر سے پاؤں تک حیانامے کا تجزیہ کر رہا تھا۔

غزل نے بیزاری سے کہا۔ "پلیز! دوپٹہ دیں۔"

اچانک مجسمے میں جان پڑ گئی۔ وہ حیا سے بولتے ہوئے اچھی لگ رہی تھی۔

"میں دینے سے انکار تو نہیں کر رہا۔ میری طرف رخ کریں اور لے جائیں۔"

"آپ دوپٹہ رکھ کر چلے جائیں۔ میں خود لے لوں گی۔"

اسے شرم بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔ عجیب ڈھیٹ انسان ہے۔ دوسروں کو پریشان کرنے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ جب سے یہاں آیا ہے کسی نہ کسی بہانے تنگ کرتا رہتا ہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ دوپٹہ کیسے حاصل کرے؟ اچانک سکندر اس کے سامنے آگیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔ وہ بوکھلا گئی۔

وہ اس کے سر پر دوپٹہ رکھنے لگا۔ وہ اسے روکتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے......... مجھے دیں......... اور پلیز! جائیں امی آجائیں گی۔"

وہ بولا۔ "تمہارے سر پر میں آنچل نہیں رکھوں گا تو کون رکھے گا؟"

پھر اس نے سر پر آنچل رکھ دیا۔ وہ حیرت سے اسے تک رہی تھی۔ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سکندر کے کہے ہوئے جملے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ تم کون ہوتے ہو میرے دوپٹے کو چھونے والے۔

سکندر کے بجائے اس کا اپنا دل دھڑک دھڑک کر اس کے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ "یہی تو ہے جو نہ صرف تمہارے آنچل بلکہ پورے وجود کا محافظ ہے مگر تم نہیں مان رہی ہو۔ خوشبو کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

جس طرح پانی اپنی جگہ خود بنا لیتا ہے۔ اسی طرح سکندر بھی اس کے اندر دھیرے دھیرے جگہ بنا رہا تھا۔

وہ اسے سوچتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا۔ محبت کی شروعات اسی طرح ہوتی ہے کہ "تُو' تُو نہ رہے' مَیں' مَیں نہ رہوں۔"

☆======☆======☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا پھر بھی سکندر نے دھیرے سے دستک دی۔

اس نے چونک کر دیکھا پھر بولی۔ "آجائیں۔"

وہ اندر ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ غزل کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سنجیدگی سے نظریں جھکائے کسی سوچ میں گم تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے۔ بولنے والا خاموش رہتا ہے مگر سننے والا اس کی بات سنے بغیر اندازہ لگا لیتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اس نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔

وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ بعض اوقات حد درجہ محبت کرنے والے بھی انا پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ تو پھر پہلی بار اس سے کچھ کہنے آیا تھا۔ کچھ مانگنے آیا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ غزل کو کوئی بات ناگوار نہ گزرے۔ ایسا نہ ہو کہ محبت کا جذبہ صرف اسی کے دل میں سر ابھار رہا ہو اور یوں بھی یک طرفہ اظہار محبت بھیک مانگنے کے مترادف ہوتا ہے۔

وہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ اسے رہ رہ کر اقبال کے شعر کا

ایک مصرع یاد آ رہا تھا۔ "اب تُو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے؟"

وہ بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگا۔ وہ اس کی حالت دیکھ رہی تھی اور اس کے اندر کے اضطراب کو بھی سمجھ رہی تھی۔ سکندر کے ساتھ اس نے اپنا رویہ ایسے رکھا تھا جیسے اس کی ذات سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس کے محتاط رہنے کے باعث ہی وہ تذبذب میں مبتلا تھا۔

وہ بے تکان بولنے والا آج خاموش تھا۔ لفاظی کا سحر پھونکنا بھول چکا تھا اور وہ جو ہمیشہ اس کے بے وجہ بولنے سے پریشان رہتی تھی۔ آج شدت سے چاہ رہی تھی کہ وہ کچھ بولے۔ بڑی خاموشی سے ایک کنکر تو پھینکے۔

اس نے بولنا شروع کیا۔ "میں......... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ غزل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے کیا کہنے والا تھا؟

وہ پھر بولا۔ "دماغ کہتا ہے کہ خاموش رہو مگر دل کہتا ہے جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔ چپ رہو گے تو اظہار کا دم گھٹنے لگے گا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کی بات مانوں؟ اِدھر بھی مشکل......... اُدھر بھی مشکل۔"

وہ اپنے اندر کی بات کہنے کے لئے بے چین تھا لیکن ہچکچا رہا تھا۔

وہ بولی۔ "کبھی دل کی بات ماننا چاہیے۔ کبھی دماغ کی' جس کا پلڑا بھاری ہو اس کی بات مان لیں۔"

وہ بولا۔ "وہ......... ایک بات ہے......... تم سے کہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سر جھکا لیا اور انتظار کرنے لگی۔

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "عجیب سی بات ہے۔ بات تو سیدھی سی ہے مگر کہتے کہتے کہہ نہیں پا رہا ہوں۔ کہہ تو سکتا ہوں لیکن کہتے کہتے جانے کیا ہو رہا ہے؟"

یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب دنیا کی تمام لڑکیوں کو الہام ہو جاتا ہے کہ سامنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی ایک تجسس سا رہتا ہے کہ وہ کن الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرے گا؟ وہ کیسا دل کو چھو لینے والا انداز ہو گا۔ وہ سمجھ رہی تھی مگر اس کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔

وہ کہتے کہتے جھجک رہا تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے رک رہا تھا۔ دل مچل رہا تھا۔ بڑھ بھی

جائے، کچھ تو کہہ دے۔ اندر کی پھانس چبھ رہی تھی، نکل نہیں رہی تھی۔ وہ نکال نہیں
رہا تھا۔ ایسے وقت تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اچھا بھی لگتا ہے کہ ہم سے ہمیں مانگنے والا
جھجک رہا ہے۔

اس نے کہا "یہاں آکر بہت عرصے بعد تمہیں دیکھا۔ دیکھتے ہی تمہیں یوں پہچان گیا
جیسے تم میرے اندر پہلے سے کہیں چھپی ہوئی تھیں۔ میں تمہیں اپنے اندر محسوس کرتا تھا
مگر پہچان نہیں پاتا تھا۔ یہاں تم روبرو ہوئیں تو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہی وجہ تھی کہ
پہلے ہی دن تمہیں پرپوز کیا۔ اب پھر وہی شادی کی بات کر رہا ہوں۔ تو کتنی مشکل پیش
آرہی ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ میں نے آخر کہہ ہی دیا۔"

کہاں تو وہ اس کی زبان سے کچھ سننے کے لئے بے چین تھی۔ کہاں یہ کہ دل کی
دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ ایک دم سے بدن گرم ہونے لگا۔ اندر کا موسم بدلنے لگا۔
حرارت بڑھنے لگی۔ اس کے قریب بیٹھا نہیں جا رہا تھا اور وہاں سے اٹھنے کو بھی دل نہیں
چاہ رہا تھا۔ اس کی زبان سے اور بہت کچھ سننے کو جی کر رہا تھا۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی، اسی طرح کشمکش میں مبتلا رہے گی تو دم اُلجھتا رہے گا۔
اسے ٹھنڈک چاہئے تھی۔ ٹھنڈی ہوا چاہئے تھی، وہ کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینا
چاہتی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے نظریں چرا کر
جانے لگی۔ وہ بھی کشمکش میں تھا۔ ایک سوال الجھا رہا تھا کہ جانے بے خودی میں کیا کہہ گیا
ہے؟ شاید وہ شرما رہی ہے؟ شاید وہ بُرا مان رہی ہے؟

یوں اچانک اٹھ کر جانا سمجھ میں نہیں آیا۔ انداز ایسا تھا جیسے شرما رہی ہو اور انداز
ایسا بھی تھا جیسے بات بُری لگی ہو اور وہ پاس بیٹھنا گوارا نہ کر رہی ہو۔

اس نے آواز دی۔ "سنو.........!"

سننے والی کمرے سے جا چکی تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر اس کے پیچھے آگیا۔ شاید وہ باہر
چلی گئی تھی۔ اس نے باہر آکر دیکھا۔ وہ گلی کے اس پار سامنے والے مکان کے دروازے
پر کھڑی ہوئی پڑوسن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور چور نظروں سے گھر کی طرف
دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی یوں منہ پھیر لیا جیسے پڑوسن سے بہت ہی اہم گفتگو کر رہی

ہو۔

وہ اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ وہاں کیا کر رہی ہے؟ اس
وقت آنٹی اور انکل گھر پر نہیں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجھ سے کھل کر بات کرتی۔ جانے
پھر موقع ملے یا نہ ملے؟ مجھے بھی کل یہاں سے چلے جانا ہے۔

غزل کے ابو نے اس کی رہائش کے لئے ایک کمرے کے مکان کا بندوبست کر دیا تھا
اور کل اسے وہاں منتقل ہو جانا تھا۔

آج غزل کی امی اپنے بڑے بیٹے کے گھر گئی تھیں اور ابو ڈیوٹی پر تھے۔ اسی لئے
سکندر نے اس سے بات کرنے کے لئے آج کا دن منتخب کیا تھا اور جب اس نے ہمت
کر کے اظہارِ محبت کیا تو وہ گھر سے باہر ہی چلی گئی۔ ان لڑکیوں کی ادائیں سمجھ میں نہیں
آتیں۔ ذو معنی ہوتی ہیں۔ دکھاتی کچھ ہیں اور سمجھاتی کچھ ہیں۔

رات کو کھانے پر غزل کو نہ پا کر وہ حیران ہوا۔ آنٹی سے پوچھنے پر پتا چلا کہ اسے
بہت تیز بخار ہے اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے۔

اس نے سوچا عجیب نازک مزاج ہے۔ ایک پھول مارنے سے بیمار ہو گئی ہے۔ ابھی
صرف زبان ہلانے سے بخار آگیا۔ کبھی ہاتھ پکڑوں گا تو کیا ہو گا؟ ٹوٹ کر بازوؤں میں بکھر
جائے گی۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ بخار تیز نہیں تھا پھر بھی بدن جل رہا تھا۔ اسے
کیا معلوم تھا کہ پہلی بار کوئی آکر اسم پھونکے گا، تو وہ ایک ہی پھونک میں یوں اڑ جائے گی
زمین پر پاؤں نہیں رکھ پائے گی۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ کروٹیں بدل رہی تھی اور سوچ رہی تھی اچھا ہی ہوا
کہ بیمار پڑ گئی۔ اسی بہانے اپنے کمرے تک محدود ہو گئی۔ اس سے سامنا نہیں ہو رہا ہے۔
سامنا ہوتا تو جانے وہ پھر کیسی باتیں کرتا؟ اور وہ اسے کوئی جواب نہ دے پاتی۔

وہ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھ لگ
گئی۔ اگرچہ وہ کمرے میں رہ کر اس سے منہ چھپا رہی تھی لیکن دل میں یہ شکایت تھی کہ
اسے تو مزاج پُرسی کے لئے آنا چاہئے۔ پھر اس نے ایک سائے کو دیکھا۔ پہلے وہ سامنے والی
دیوار پر دکھائی دیا پھر فرش پر رینگتا ہوا اس کے بستر پر آگیا۔ وہ لیٹے لیٹے اپنے آپ میں

سمٹنے لگی۔

وہ اس کے کان کے قریب آکر دھیمی سرگوشی میں بولا۔ "تم تو خوابوں میں بھی شرماتی ہو۔ خواب مختصر ہوتے ہیں۔ شرمانے میں وقت ضائع نہ کرو۔ آنکھ کھل جائے گی تو میں گم ہو جاؤں گا۔"

وہ خواب تھا۔ خوابوں کا شہزادہ تھا۔ خوابوں میں کسی کی دست درازی کو روکا نہیں جاسکتا۔ وہ اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں سے چھو رہا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ ٹوکنا چاہتی تھی مگر کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنے چہرے پر اس کی سانسوں کی گرمی محسوس کر رہی تھی۔

پھر وہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔ اس کے لبوں کی پنکھڑیاں شکنجے میں آگئی تھیں۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ ہونٹوں سے ہونٹوں کی واردات ہو رہی تھی۔ جیسے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ویسے ہی کاٹ رہا تھا اور یہ کٹ رہی تھی۔ ایسی زبردستی تھی کہ دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو ایک دم سے آنکھ کھل گئی۔

وہ خواب نہیں تھا' حقیقت تھی۔ سایہ نہیں تھا' وجود تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تو دکھائی دیا چوری سے آیا تھا۔ چوری سے جا رہا تھا۔ وہ ایسا چور تھا کہ وہ چیخ چیخ کر گھر والوں کو نہیں اٹھا سکتی تھی۔ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کیا چرا کر لے جا رہا ہے۔

چور جا چکا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل اس بری طرح سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی دیوار توڑ کر باہر آجائے گا۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس نے ایسی حرکت کیوں کی؟ کیا میں ایسی ویسی ہوں؟ کیا میری کوئی انا' کوئی خودداری نہیں ہے؟ کیا میری چیز مجھ سے مانگی نہیں جاسکتی تھی۔ چھیننا ضروری تھا؟ اس نے کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟

وہ منہ چھپا کر رونے لگی۔

صبح آنکھ کھلی تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ تکیئے سے اُٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ پھر سونا چاہتی تھی لیکن بند آنکھوں کے پیچھے ہونٹ جلنے لگے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھ کھولنے سے بھی جلن نہیں گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ صبح جانے والا تھا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھلے ہوئے دروازے سے باہر

دیکھا۔ صحن میں دھوپ اتر آئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی ابھی صبح ہوئی ہے۔ یہاں تو آدھا دن گزرنے والا تھا۔ وہ تو جا چکا ہو گا۔

ایک دم سے یوں لگا جیسے ہاتھوں سے دونوں جہان نکل گئے ہوں۔ اس نے بے اختیار انکار میں سر ہلایا۔ دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر چلا گیا ہو گا۔

وہ بستر پر سے اٹھ کر بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئی اس کی امی پڑوسن کی ایک قمیض سی رہی تھی اور وہ پڑوسن اس کے پاس بیٹھی سلائی کی تعریف کر رہی تھی۔ وہ دوسری طرف جاتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑانے لگی۔ "امی تو بس اپنی تعریف سن کر پگھل جاتی ہیں۔ آنٹی بھی بڑی چالاک ہیں۔ امی کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہیں۔ خوب ڈونگے بھر بھر کر تعریفیں کرتی ہیں اور چالیس روپے میں ایک قمیض سلوا کر لے جاتی ہیں جبکہ دوسری عورتیں اسی یا نوے سے کم سلائی نہیں لیتیں۔"

وہ اپنی امی کے بھولے پن سے بڑبڑا رہی تھی مگر اس کا سارا دھیان سکندر کی طرف لگا ہوا تھا وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس کمرے میں رہتا تھا۔ وہاں اس کا سامان نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ واقعی جا چکا تھا۔ وہ ایک دم سے خالی خالی سی ہو کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا تھا صبح سامنا ہو گا تو اسے غصہ دکھائے گی۔ اس سے بات نہیں کرے گی۔ اگر بولنے پر مجبور کرے گا تو اسے ایک کی دس سنائے گی لیکن اس نے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ شب خون مار کر چلا گیا۔

وقت گزرنے لگا۔ وہ ہوتا تو وقت گزر ہی جاتا۔ اب پہاڑ کی طرح کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اب پتا چلا کہ اس ایک کے نہ ہونے سے کتنا فرق پیدا ہو گیا؟ وہ ہر آہٹ پر چونکنے لگی۔ کوئی بھی آئے تو اسے یوں لگتا جیسے وہ آگیا ہے۔

لیکن وہ نہیں آرہا تھا۔ پیار کی پہلی مہر لگا کر اس کے تمام جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر کے چلا گیا تھا۔ اچھی زبردستی تھی۔ اس کے خیالوں کو' اس کے احساسات کو' اس کے جذبات کو جبراً اپنے نام کر گیا تھا۔ اب وہ سوچتی تھی تو اس کے لیے۔ در پر نظر جاتی تھی تو اسے پانے کے لیے۔ وہ کبھی غصے سے' کبھی بے بسی سے سوچنے لگی۔ جب جانا ہی تھا اور واپس نہیں آنا تھا تو ایسا کیوں کیا؟ بڑی مجبوری تھی کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی۔

کبھی کبھی اسے اپنے ابو سے خبر ملتی تھی کہ وہ کسی فٹ پاتھ پر یا کسی بازار میں دکھائی دیا تھا۔ وہ بس میں بیٹھے ہوتے تھے گزر جاتے تھے۔ اس سے بات نہیں ہو پاتی تھی۔

ایک روز وہ کام میں مصروف تھی۔ اس کے ابو باہر سے تھکے ہوئے انداز میں آئے۔ ایک چارپائی پر بیٹھ کر کراہتے ہوئے بولے۔ "ایک تو کھانسی اور بلغم نے پیچھا پکڑ لیا ہے پھر سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ بس اسٹاپ سے یہاں تک آتے آتے یوں لگتا ہے جیسے سانسیں پوری ہوجائیں گی پھر نہیں آئیں گی۔"

اس کی امی نے کہا۔ "بیماریاں وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیتی ہیں۔ جوان بیٹا ساتھ چھوڑ دے تو اور کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اب آپ اکیلے کہاں تک محنت کریں گے؟"

انہوں نے کہا۔ "فیکٹری کا منیجر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں اب اتنی دور جانے اور کام کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ مجھے اب گھر میں پڑا رہنا چاہئے۔"

وہ گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ کبھی کھانسنے لگے۔ کبھی بلغم تھوکنے لگے۔

وہ اپنے ابو کو دیکھ رہی تھی۔ کام کر رہی تھی اور بڑے کرب سے سوچ رہی تھی۔ اس بڑھاپے میں یہ پورے گھر کا بوجھ کب تک اٹھاتے رہیں گے؟ کبھی کبھی تو ان کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ یہ انہیلر منہ میں لے کر سانسیں کھینچتے ہیں۔ تب سانس بحال ہوتی ہے۔

اس کی امی نے کہا۔ "آپ زیادہ بات مت کریں اور آرام سے لیٹ جائیں۔"

انہوں نے لیٹ کر کمر سیدھی کرتے ہوئے اور کراہتے ہوئے کہا۔ "میں تو بوڑھا ہوں۔ پھر بھی آرام سے ہوں' لیکن آج سکندر کو دیکھ کر تکلیف ہوئی۔"

غزل کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ چولہے سے دیگچی اتار رہی تھی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ صافی ہاتھ میں ہونے کے باوجود اس نے گرم دیگچی پکڑلی تھی۔

ماں نے دوسرے کمرے سے پوچھا۔ "کیا ہوا غزل؟"

"کچھ نہیں.......... وہ.......... وہ.......... دیگچی گرم تھی۔"

دیگچی گرم نہیں تھی۔ خبر گرم تھی۔ وہ کچن میں نہ ہوتی تب بھی آگ سے کھیل رہی تھی۔ اس کے ابو کہہ رہے تھے۔ "وہ ایک بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا۔ اچانک اس

سے سامنا ہوگیا۔ کیا بتاؤں؟ کیا حلیہ تھا؟ کپڑے میلے سے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔ پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ فوم کی چپل پہنے ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ میں بس میں گزرتے وقت اکثر تمہیں دیکھتا ہوں۔ کیا تم آفس نہیں جاتے ہو؟ اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ "اس کے شعبے میں ملازموں کی چھانٹی ہو رہی تھی۔ بیس ملازموں کے ساتھ اس کی بھی چھٹی ہوگئی۔ میں نے کہا۔ تمہیں گھر آنا چاہئے تھا۔ دو مہینے ہوگئے۔ تم نے صورت تک نہیں دکھائی۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔ کل آئے گا۔"

غزل دروازے سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سکندر کے حالات جان کر دل دُکھ رہا تھا۔ اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ "وہ بارہ جماعتیں پڑھ چکا ہے۔ کیا آپ کی فیکٹری میں اسے کوئی کام نہیں مل سکتا؟"

وہ بولے۔ "وہ کام کیا کرے گا پتا نہیں کیا کرتا پھر رہا ہے؟ سڑک کے اس پار ایک پولیس انسپکٹر اور تین سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ سکندر انہیں دیکھ کر وہاں سے جانے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ بیٹے رکو تو سہی کہاں جارہے ہو؟ وہ ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھڑا کر بولا۔ "بہت ضروری کام ہے انکل۔ میں کل آؤں گا.......... ضرور آؤں گا۔" وہ یہ کہہ کر ایک طرف تیز تیز چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ دونوں طرف سڑک پر گاڑیوں کی بھرمار تھی۔ پولیس والوں کو راستہ پار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب موقع ملا تو وہ دوڑتے ہوئے اسی بس اسٹاپ پر آئے۔ دور دور تک دیکھنے لگے۔ انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ "بڑے میاں! ابھی ایک جوان آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟" مجھ بوڑھے کی عقل نے سمجھا ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میں شناسائی ظاہر کروں گا تو پولیس والوں کے چکر میں پڑ جاؤں گا۔"

وہ بولتے بولتے کھانسنے لگے پھر کھانستے کھانستے بولنے لگے۔ "میں نے انکار میں سرہلا کر کہا۔ میں نہیں جانتا' وہ کون تھا؟ میں اس سے شرف آباد جانے والی بس کا نمبر پوچھ رہا تھا۔ وہ مجھے اس بس کا روٹ سمجھا رہا تھا۔"

انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا۔ "تم ادھر جاؤ.......... اور تم ادھر۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

وہ اتنا بولتے ہی پھر کھانسنے لگے۔ اس کی امی نے کہا۔ "پولیس والوں کو کوئی غلط فہمی

ہوئی ہے۔ سکندر تو نیک لڑکا ہے وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا کہ پولیس پیچھے پڑ جائے۔"

وہ گہری گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ "میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ کسی کو نیک سمجھ لینے سے وہ فرشتہ نہیں بن جاتا۔ پولیس والے پاگل نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ اس کے پیچھے نہیں بھاگ رہے ہوں گے۔"

اس کی امی سوچ میں پڑ گئیں۔ سوچنا تو غزل کو تھا اور وہ گہرے صدمے سے سوچ رہی تھیں کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے؟ اگر اس کی ملازمت چلی گئی ہے' اگر اس پر مصیبتیں آرہی ہیں تو اسے یہاں آنا چاہئے تھا۔ وہ اسے اپنے آنچل میں چھپا لیتیں۔

ویسے یہ بات ماں بیٹی دونوں ہی کو کھٹک رہی تھی کہ پولیس اسے گرفتار کیوں کرنا چاہ رہی تھی؟ کیا ملازمت چھوٹ جانے کے بعد کسی غلط راستے پر پڑ گیا ہے؟ غزل یہ سوچ کر دکھی ہو رہی تھی کہ جب اس کی ملازمت بحال تھی۔ اس کے حالات اچھے تھے۔ تب وہ کیوں نہیں آیا؟ کیا اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے؟ وہ اسے چوم کر ایسے چلا گیا جیسے تھوک کر چلا گیا ہو۔

اس کا رویہ تو یہی بتا رہا تھا کہ اس کی نظروں میں اس ایک رات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رات گئی' بات گئی' کے مصداق وہ اسے بھول چکا تھا۔ اس نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ کیا اس کا وعدہ کیا؟ پکا جھوٹا تھا۔ دوسرے دن بھی نہیں آیا۔ تیسرے دن بھی نہیں آیا۔ وہ اندر سے ٹوٹ گئی۔

اچانک ایک ہفتے بعد وہ آگیا۔ غزل کو یوں لگا جیسے پہلی بار تازہ ہوا کا جھونکا آیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ سکندر کھلے ہوئے دروازے سے صحن میں نظر آرہا تھا۔

اس کے ابو کہہ رہے تھے۔ "آج منہ دکھا رہے ہو۔ پولیس والوں سے کہاں چھپتے پھر رہے ہو؟ میں نے تمہارے باپ کو چٹھی لکھی ہے۔ یہ صاف صاف لکھ دیا ہے کہ تم غلط راستے پر چل پڑے ہو۔"

وہ ایک اخبار دکھاتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ آج کا اخبار دیکھیں اس میں سکندر خان نامی ایک ڈاکو کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ پولیس مجھ پر شبہ کر رہی تھی۔ میرا نام بھی سکندر ہے۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے چھپتا پھر رہا تھا۔ کل اس سکندر خان کو گرفتار کیا گیا ہے۔ علاقے کے کونسلر نے میری ضمانت لی ہے۔

اب نہ مجھ پر الزام ہے اور نہ ہی پولیس میرے پیچھے ہے۔"

اس کے ابو اخبار کی اس خبر کو پڑھ رہے تھے۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

اس کی امی نے کہا۔ "تم یہاں سے گئے تو پلٹ کر نہیں آئے۔ ایسی بھی کیا بے مروتی ہے؟ کبھی گھڑی دو گھڑی کے لئے تو آسکتے تھے؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "میں یہاں سے گیا تو ایک ہفتے بعد ہی مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں ابو کا انتقال ہو گیا تھا۔"

انہوں نے چونک کر اسے بڑے دکھ سے دیکھا۔ غزل کا سینہ اس کے لئے پیار اور ہمدردی سے بھر گیا۔ اس کے ابو نے کہا۔ "تم نے ہمیں اطلاع نہیں دی؟"

"کیسے اطلاع دیتا؟ یہاں آتے ہی ڈکیتی کے کیس میں پھنس گیا تھا۔ پولیس والوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں آؤں تو پولیس والے آپ کو بھی تنگ کریں۔"

اس نے چور نظروں سے غزل کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بولا۔ "یہاں آنے اور آپ لوگوں سے ملنے کے لئے میرا دل تڑپتا رہا۔ آنٹی! میں بے مروت نہیں ہوں۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔"

وہ آنٹی سے بول رہا تھا۔ غزل سمجھ رہی تھی کہ یہ ساری باتیں اس سے کہی جا رہی ہیں۔ وہ اس رات کے بعد نہ آنے کے سلسلے میں صفائی پیش کر رہا تھا اور غزل کا دل صاف ہو رہا تھا۔ امی نے کہا۔ "بیٹے! ہمیں افسوس ہے۔ پانچ برس پہلے تمہاری امی کا انتقال ہوا تھا اور اب تمہارے ابو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خود کو تنہا نہ سمجھو ہم تمہارے بزرگ ہیں۔ ہمارا سایہ تمہارے سر پر رہے گا۔"

اس کے حالات بدل گئے تھے۔ اس نے جینز اور شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پہلے شلوار قمیض میں رہا کرتا تھا۔ اس کی تمام جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک جیب سے ایک گڈی نکالی۔ اس میں سے ہزار کا ایک نوٹ نکالا۔ کن انکھیوں سے غزل کو دیکھا پھر اس کی امی سے کہا۔ "آنٹی' ہوٹل کا کھانا کھاتے کھاتے پیٹ خراب ہو گیا ہے۔ آج آپ کے ہاتھوں کا کھانا کھاؤں گا۔"

وہ ناراض ہو کر بولیں۔ "کیا تم ہمیں کھانے کے پیسے دو گے؟"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ کیا بیٹے کی کمائی پر آپ کا حق نہیں ہے۔ امی زندہ ہوتیں تو کیا وہ مجھ سے رقم نہ لیتیں؟"

اس نے زبردستی وہ نوٹ ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ غزل کے ابو نے پوچھا۔

"ایک ہفتہ پہلے تمہاری حالت بہت ہی خستہ تھی۔ یہ تم اچانک دولت مند کیسے بن گئے؟"

وہ بولا۔ "اللہ کی دین ہے۔ میں نے بزنس شروع کیا ہے۔"

"بزنس کے لئے سرمایہ کہاں سے مل گیا؟"

"سرمایہ میرے دوست کا ہے۔ میں ورکنگ پارٹنر ہوں۔ ہم دکانوں سے آرڈر لیتے ہیں اور ان کی ضرورت کے مطابق مال سپلائی کرتے ہیں۔"

آنٹی نے کہا۔ "یہ تو اچھا کام ہے۔ اللہ تمہارے کاروبار میں ترقی دے۔"

وہ اچانک پلٹ کر صحن میں سے گزرتا ہوا غزل کے کمرے میں آگیا۔ وہ ایک دم سے بدحواس ہو گئی۔ یہ سوچا بھی نہیں کہ وہ یک بیک یوں قریب چلا آئے گا۔ وہ جلدی جلدی اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "ہائے! کیسی ہو؟"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "آپ کی بلا سے جیسی بھی ہوں جی رہی ہوں۔"

"مجھ سے ناراض ہو؟"

"آپ سے ناراض ہونے کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"میں رشتے کی ابتدا کر کے گیا تھا۔ کبھی موقع ملا تو انتہا بھی کر دوں گا۔"

"کوئی زبردستی ہے؟ آپ نے پھر کبھی ہاتھ بھی لگایا تو امی ابو سے کہہ دوں گی۔"

"کہہ دینا۔ بزرگوں سے سزا ملے گی یا پھر انعام کے طور پر تم ملو گی۔"

اس نے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ لو.........."

وہ حیرانی سے بولی۔ "یہ کیا؟ مجھے رشوت دے رہے ہیں؟"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میری کمائی تمہارے لئے ہے۔ اس رقم سے نئے جوڑے سلوا لینا۔ میں کسی دن آکر تمہیں نئے لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مہمانوں کی طرح آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں روز نہیں آسکتا۔ بہت مصروف رہتا ہوں۔ یہ لو.........."

"مجھے نہیں لینا ہے.........."

"سیدھی طرح کہہ رہا ہوں۔ لے لو۔"

"نہیں لوں گی۔ کوئی زبردستی ہے؟"

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ صحن میں بیٹھے ہوئے بزرگ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس نے نوٹوں کا گولا بنا کر بڑی پھرتی سے اس کے دوپٹے کو کھینچا، پھر اس گولے کو اس کے گریبان میں ٹھونس کر فوراً پلٹ کر چلا گیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے سر سے پاؤں تک سن ہو گئی۔ جیسے لہو کی گردش تھم گئی، وہ گولا دھڑکنوں کی وادی میں پہنچ گیا تھا۔ پھر یکبارگی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ دھم سے بستر پر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے سینے کو چھپا لیا۔ اب چھپانے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ جرأت دکھا گیا تھا اور کہہ گیا تھا ابھی ابتدا کر رہا ہوں۔ کسی دن انتہا کر دوں گا۔

وہ دوبارہ صحن میں اس کی امی اور ابو کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اسی وقت باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ابو دروازہ کھول کر باہر آئے۔ سکندر نے بھی ان کے پیچھے آکر دیکھا۔ باہر ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"سکندر! تمہیں ابھی بلایا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "اچانک آرڈر آیا ہے ہمیں فوراً پہنچنا ہے۔"

انکل ان سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سکندر نے ان کی تسلی کے لئے ساتھیوں سے کہا۔ "اچھا۔ نیا آرڈر آیا ہے۔ مال سپلائی کرنا ہے۔ ابھی چلتا ہوں۔"

پھر اس نے انکل سے کہا۔ "سوری انکل! اچانک کام آن پڑا ہے۔ مجھے جانا ہے۔ آپ جانتے ہیں نیا نیا کام ہے۔"

"کھانا پکوا رہے ہو۔ کھاؤ گے نہیں؟"

"پھر کسی دن آکر کھالوں گا۔"

وہ انہیں خداحافظ کہہ کر جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ غزل اور اس کی امی نے دروازے پر آکر دیکھا۔ اس کی جیپ نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اس کی امی نے کہا۔

"ایسا بھی کیا کام ہے۔ کھانا چھوڑ کر چلا گیا۔"

اس کے ابو گہری سوچتی ہوئی نظروں سے اُدھر دیکھ رہے تھے۔ جہاں اب جیپ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اڑتی ہوئی دھول رہ گئی تھی۔ غزل نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہاں گولا دھڑک رہا تھا اور وہ سنسناتے ہوئے گولے کی طرح گزر چکا تھا۔

☆======☆======☆

وہ خیالوں کی دنیا سے واپس آگئی۔

"یاد ماضی عذاب ہے یارب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا"

سکندر کے ساتھ گزرے ہوئے مختصر سے لمحات رنگین تھے لیکن ان کی یادیں سنگین تھیں۔ وہ آخری بار جیپ میں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہیں گیا تھا پھر تین ماہ تک کہیں گم رہا تھا۔ اس بار آیا تو ایک بکے اور ماضی کی ایک یادگار تصویر لے کر آیا اور یہ پیغام چھوڑ گیا کہ ایک ہفتے کے لئے لاہور جا رہا ہے۔

وہ پھر ہوا کی طرح آیا تھا اور ہوا کی طرح گزر گیا تھا۔ عجیب بے نیاز شخص تھا۔ پیار کی نادیدہ زنجیر پہنا گیا تھا کہ ایک طرف پڑی رہو جب وہ ضروری سمجھے گا تو آجایا کرے گا ورنہ اس کے انتظار میں شاعری کرتی رہو۔

اس نے بکے کو اٹھا کر دیکھا۔ پھول ابھی تک تازہ تھے۔ خوش رنگ تھے۔ خوشبو لٹا رہے تھے۔ اس کے درمیان ایک تہہ کیا ہوا کاغذ دکھائی دیا۔ اس نے فوراً ہی اسے وہاں سے نکالا پھر کھول کر پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"جانِ من! میں اپنے آپ کو بھول سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں بھول سکتا۔ تمہاری یادیں میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہی ہیں۔ تم کہو گی یہ سچ نہیں ہے۔ میرے پیار میں سچائی ہوتی تو یوں تم سے دور دور نہ رہتا۔

میں اپنی مجبوریاں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ میرے پیروں میں گردش ہے۔ دن رات چلتا رہتا ہوں۔ کبھی تمہارے قریب آتا ہوں۔ کبھی دور نکل جاتا ہوں۔ اس بار کوشش کروں گا تمہارے قریب رہا کروں اور تمہاری شکایتیں دور کردوں۔

تم یہ تصویر دیکھ کر حیران ہو رہی ہوگی۔ جب میں پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا تب

ایک خود کار کیمرے کو چھپا رکھا تھا۔ اپنی اور تمہاری کئی تصویریں اتاری تھیں۔ ان میں سے یہی ایک پرنٹ کے قابل تھی۔ بہرحال یہ سرپرائز کیسا رہا۔ تمہیں خبر بھی نہ ہوئی اور ایک یادگار تصویر تمہارے ہاتھوں میں آگئی۔"

وہ خط پڑھتے پڑھتے تصویر کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ابھی اس پر غصہ آ رہا تھا۔ ابھی پیار آنے لگا تھا۔ کیسا چھلیا تھا؟ اس سے چھل کرتا رہا۔ چپ چاپ تصویریں اتارتا رہا۔ اسے اپنے دل میں نقش کرتا رہا اور وہ سمجھتی رہی کہ وہ بے حس ہرجائی ہے۔ اس سے دور رہتا ہے مگر وہ تو اسے اپنی سانسوں کے قریب رکھتا ہے۔

وہ تصویر کو سینے سے لگا کر سوچنے لگی۔ پچھلے تین ماہ سے اس کی آنکھوں سے دور رہی تھی۔ ان تین مہینوں میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ گھر کی کتنی ہی ذمے داریاں سر پر اٹھالی تھیں۔ اس کے ابو بیماری سے اتنے ٹوٹ گئے تھے کہ بستر سے اٹھ نہیں پاتے تھے۔ اسے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ صبح سے دوپہر تک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ شام کو چھوٹی کلاس کے بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔

صبح سے شام تک محنت کے بعد ماہانہ دو ہزار ملتے تھے۔ زندگی ایک چیلنج بن گئی تھی۔ للکار رہی تھی کہ مجھے گزار کر دیکھو۔ میں گزرنے والی نہیں ہوں۔ تمہیں پیدا ہونے کی سزا ملتی رہے گی۔

ویسے حالات کتنے ہی بدتر ہوں۔ اگر کبھی کبھی تھوڑی سی خوشی اتفاقاً مل جائے تو زندگی گزارنے کا حوصلہ پیدا ہونے لگتا ہے اور اگر کسی کی محبت مل جائے تو زندگی کی بدصورتی موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتی۔ خزاں میں پھول کھلتے رہتے ہیں۔ سکندر کے آجانے سے اس کے احساسات میں کچھ ایسے ہی پھول کھلنے لگے تھے۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ سکندر کے آجانے سے اس کے نصیب بدل جائیں گے۔ پچھلی رات ہی نواب سعد اللہ جان نے اسے ایک اچھی ملازمت کی آفر دی تھی۔ وہ کسی فیکٹری یا آفس میں جاکر کام کرنے سے گھبراتی تھی۔ اس نے سنا تھا اور فیکٹریوں میں کام کرنے والی ان عورتوں کو بھی دیکھا تھا جو محلے میں رہتی تھیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔ قیمتی لباس پہننے لگی تھیں۔ مہنگا میک اپ کرکے گھروں سے نکلنے لگی تھیں۔ ان کے ہاں کلر ٹی وی آگئے تھے۔ فرش پر قالین بچھ گئے تھے۔ انہوں نے بدترین حالات سے

لڑنے کے لئے دنیا والوں کی پروا نہیں کی تھی۔ بڑے ہی باغیانہ انداز میں زندگی گزار رہی تھیں۔

غزل میں اتنا حوصلہ تھا اور نہ ہی وہ ایسی بے حیائی کے متعلق سوچنا چاہتی تھی۔ نواب سعد اللہ جان نے اسے یقین دلایا تھا کہ ان کی فیکٹری میں کام کرنے والی عورتوں کی عزت کی جاتی ہے اور انہیں مرد حضرات سے فاصلہ رکھ کر کام کرنے کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔

اس نے ملازمت کرنے کے سلسلے میں سعد اللہ جان کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پہلے اپنی امی اور ابو سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی ماں نے کہا۔ "گھر میں اور تو کوئی بیٹا نہیں ہے۔ تمہارے باپ نے بستر پکڑ لیا ہے۔ اب تو تم ہی بیٹی ہو۔ تم ہی بیٹا ہو۔ جو بہتر سمجھتی ہو وہ کرو۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "تمہاری آنکھوں میں حیا ہے۔ سر پر آنچل ہے۔ اپنی عزت کی تم آپ محافظ ہو۔ ملازمت اچھی ہے تو پھر اللہ کا نام لے کر ضرور کرو۔"

بوڑھے ماں باپ یہی فیصلہ کر سکتے تھے۔ تین وقت کی روٹی کے لئے اور اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے اسی ایک بیٹی پر انہیں تکیہ کرنا تھا لیکن ان کے علاوہ ایک ہستی ایسی تھی جو اس کی زندگی میں اہمیت اختیار کر رہی تھی۔ وہ اپنے مستقبل میں دور تک سکندر کو اپنے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اپنی پوری زندگی اس کے نام کرنے کے لئے لازمی تھا کہ وہ ایک نئی ملازمت کے سلسلے میں اس سے بھی مشورہ کرے بلکہ اس سے اجازت حاصل کرے۔ اس کے اندر کی لڑکی یہ چاہتی تھی کہ وہ اس کا مالک و مختار ہو۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اسے ڈھالتا رہے اور وہ ڈھلتی رہے۔ اس کی مرضی اور پسند کے بغیر کوئی کام نہ کرے۔

اس نے طے کر لیا کہ سکندر کا انتظار کرے گی۔ جب وہ ایک ہفتے بعد آئے گا تو وہ اس کی مرضی معلوم کرے گی۔ اگر وہ اجازت نہیں دے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ اس کا بوجھ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ مسکرا کر سوچنے لگی۔ "ہائے......... یہ کتنا اچھا لگتا ہے کہ مرد ہمارا بوجھ اٹھائے اور ہماری تمام ذمے داریاں اپنے سر لے لے۔"

وہ پچھلی رات مشاعرے میں جاگتی رہی تھی اس لئے شام تک سوتی رہی۔ مغرب کی

نماز سے پہلے ماں نے اسے جگایا۔ وہ جاگنے کے بعد غسل خانے میں چلی گئی۔ اس وقت نلکوں میں پانی آ رہا تھا۔ وہ شاور کھول کر بڑی دیر تک نہاتی رہی۔ اچھی طرح فریش ہو گئی۔ کچن میں آ کر روٹی کھاتے ہوئے سوچا۔ "آج عشا کی نماز پڑھے گی۔" لیکن سوچی ہوئی بات دل ہی میں رہ گئی۔ اچانک اس کے ابو کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ مسلسل کھانسنے کی وجہ سے انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ جب دورہ پڑتا تھا تو وہ سانس نہیں لے پاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اب تب میں سانس اکھڑنے والی ہو۔ دونوں ماں بیٹی ہل کر رہ جاتی تھیں۔

ایسی ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا ضروری ہو جاتا تھا۔ انہیلر کے ذریعے سانسیں درست نہیں ہوتی تھیں۔ اسپتال میں مصنوعی آکسیجن کے ذریعے ہی سانسوں کی بحالی ممکن ہوتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسی صورتِ حال تھی۔

اس کی امی نے کہا۔ "اپنے ابو کو سنبھالو۔" وہ اپنے ابو کو کیا سنبھالتی؟ سنبھالنے کا مطلب تھا کہ وہ ان کی سانسیں بحال کرتی اور یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا جو اس کے اختیار میں تھا۔ وہی کرنے لگی۔ وہ آیتیں پڑھ پڑھ کر ان پر پھونکنے لگی۔

وہ ایسا علاقہ تھا جہاں رکشے اور ٹیکسیاں دن کے وقت بھی بہ مشکل ملتی تھیں۔ وہاں سے صرف بسیں اور ویگنیں جایا کرتی تھیں۔ ایسی حالت میں اس کے ابو کو کسی بس یا ویگن میں نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ پسماندہ علاقوں میں بیماروں......... کو لانے لے جانے کے لئے ایسے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایمبولینس کے لئے فون کرو تو اس کے پہنچنے سے پہلے مریض اوپر پہنچ جاتا ہے۔ محلے میں ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اتفاق سے ان وقت وہ موجود تھا۔ اس نے انہیں اسپتال پہنچا دیا۔

اس کے ابو کی حالت بہت ہی تشویش ناک تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں انہیں ایک ڈاکٹر کے بعد دوسرا ڈاکٹر اٹینڈ کرتا رہا۔ آکسیجن ماسک چڑھانے کے بعد ان کی سانسیں کسی قدر بحال ہونے لگیں۔

ڈاکٹر نے بتایا۔ "مرض تشویش ناک ہے۔ سانس کی نالی میں انفیکشن ہو گیا ہے۔ شاید آپریشن کرنا ہوگا۔ فی الحال انہیں آبزرویشن کے لئے اسپتال میں رکھا جائے گا۔"

وہ تمام رات پلکیں جھپکائے بغیر گزر گئی۔ صبح اس کی امی نے کہا۔ "تم گھر جاؤ۔ میں

تمہارے ابو کے پاس رہوں گی۔ میں دوپہر کو پڑوسن کے گھر فون کر کے تم سے بات کروں گی۔ تمہارے ابو کے حالات تمہیں بتاؤں گی۔"

"امی! اگر آپریشن کی نوبت آئے گی تو اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی۔"

"یہ جناح اسپتال ہے۔ یہاں آپریشن وغیرہ کے سلسلے میں رقم نہیں لی جاتی ہے۔ صرف باہر سے دوائیں خریدنی پڑتی ہیں۔ اگر دو چار ہزار کی ضرورت ہوگی تو ہم ٹی وی بیچ دیں گے۔"

وہ سر جھکا کر گھر چلی گئی۔ اس کے پاس سونے کے زیورات نہیں تھے۔ ایک مہنگی چیز ٹی وی تھا۔ جسے برے وقت میں فروخت کیا جاسکتا تھا۔ گھر پہنچ کر یاد آیا کہ اس کے پاس نقد دو ہزار روپے ہیں۔ سکندر نے ہزار ہزار کے دو نوٹوں کے گولے بنا کر اس کے وجود پر گولے برسائے تھے۔ اس وقت یہ حرکت اوچھی لگی تھی۔ اب اچھی لگ رہی تھی۔ وہ گولے اب کام آنے والے تھے۔ اس کے ابو کی مسیحائی کرنے والے تھے۔

سکندر نے کہا تھا' وہ اسے نئے لباس میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے بھی سوچا' وہ نیا خوبصورت سا لباس سلوائے گی' ایک ہفتے بعد وہ آئے گا تو اسے نئی نئی سی لگے گی' لیکن غم دوراں کے آگے کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ وہ جیسی ہے ویسی ہی اس کے سامنے جائے گی۔ وہ ضرور اس کی مجبوریوں کو سمجھ لے گا۔

دو دن اور دو راتیں گزر گئیں۔ مزید تین دنوں کے بعد فیصلہ ہونے والا تھا کہ شاید میجر آپریشن نہ ہو۔ مائنر آپریشن کے ذریعے سانس لینے کا مصنوعی آلہ ان کی سانسوں کی نلی سے منسلک کیا جائے گا۔

ان ماں بیٹی کے لئے یہ دن رات بڑے کرب میں گزر رہے تھے۔ ایک جوان بیٹا تھا' جو شرمندہ سا تھا۔ اپنی محدود آمدنی میں اپنی بیوی اور بچوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا.......... ماں باپ کے اخراجات کیسے پورے کرتا؟

اس کی امی کبھی گھر آتی تھیں۔ غسل کر کے لباس تبدیل کر کے کھانا کھاتی تھیں۔ کچھ سوپ وغیرہ اس کے ابو کے لئے لے جاتی تھیں۔ وہ اس مکان میں تنہا رہنے لگی تھی۔ ایک شام جب سورج ڈوب رہا تھا اور اندھیرا پھیل رہا تھا تب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو خوشی سے کھِل گئی۔ سامنے سکندر کھڑا تھا۔

ایسا لگا' ڈوبنے والی کو بچانے کے لئے ایک تیراک آگیا ہے۔ وہ خوشی کے مارے رونے لگی۔ اس نے اندر آکر پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟ آنٹی اور انکل کیسے ہیں؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "وہ اسپتال میں ہیں۔ ابو کا آپریشن ہونے والا ہے۔ سانسیں بحال رکھنے کے لئے ان کے گلے میں ایک مصنوعی آلہ لگایا جائے گا۔"

وہ اپنے ابو کی بیماری اور اپنے تمام مسائل کے بارے میں بتانے لگی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کمرے میں آگئی جہاں سکندر آکر رہا کرتا تھا۔ اس نے غزل کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں آگیا ہوں۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہارے لئے آیا ہوں۔ تمہارے ایسے برے وقت میں ساتھ دینے آیا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنا ساتھی بناؤ گی۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ سر جھکا لیا۔ سکندر نے قریب ہو کر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے یوں لگا جیسے بہت مضبوط سہارا مل گیا ہو۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس سے ذرا اور لگ گئی۔ ڈوبنے والوں کو ایک ہی اطمینان رہتا ہے کہ سہارا مل گیا ہے۔ اس کے بعد آگے پیچھے کا ہوش نہیں رہتا۔ جب اسے اپنی گردن پر گرم گرم سانسوں کے بھپکے محسوس ہونے لگے تو وہ ایک دم سے لرز گئی۔ وہ گرمی آہستہ آہستہ گردن سے شانے تک رینگ رہی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں تک پہنچ جائے گا۔

وہ تو وہی کر رہا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ سہارے کے لئے آئی تھی۔ وہ سہارا دے رہا تھا۔ اسے پناہ چاہئے تھی۔ وہ اسے بازوؤں میں چھپا رہا تھا۔ وہ جس طرح خاموشی سے آئی تھی اسی طرح نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ نکلنے لگی تو پتا چلا دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ کہیں دروازہ نہیں ہے۔"

وہ کسمسانے لگی۔ "چھوڑیں۔ مجھے چھوڑیں۔"

وہ اس کے وجود پر سانسوں کے بھپکے چھوڑنے لگا۔ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "میں نے تمہیں چھوڑنے کے لئے نہیں پکڑا ہے۔ اپنے حالات پر غور کرو۔ مسائل کے ہجوم میں تنہا رہ گئی ہو۔ تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میری ضرورت ہے۔"

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن بولنے سے پہلے ہی اس نے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔ وہ بوکھلا گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ ہونٹوں کے راستے اندر اتر رہا ہے۔ پتا نہیں؟ وہ حواس پر چھا رہا ہے؟ پتا نہیں اے لڑکی! کیا انکار کرے گی؟ پتا

نہیں......... پتا نہیں...........

بڑی مدت سے اس کا انتظار کیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ انتظار کے اختتام پر بادل یوں آتا ہے اور یوں جم کر برستا ہے۔ وہ پیار سے التجا کر رہی تھی۔ "چھوڑ دو۔"

وہ پورے اختیارات سے کہہ رہا تھا۔ "گرفتار رہو..........."

وہ اتنا ہی انکار کر رہی تھی' جتنا حیا کا تقاضا تھا' لیکن انکار کا لہجہ کمزور......... کمزور سا تھا۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی مگر نہ چاہنے کے باوجود چاہ رہی تھی۔

ابتدا میں نیم رضامندی ہوتی ہے لیکن اندر خواہشوں کا ایسا میلہ لگا رہتا ہے کہ اس میں گم صم ہونے کے بعد انکار کرنے والی خود کو بھول جاتی ہے۔

وہ بھی بھول گئی۔ جذبوں کی بھیڑ میں ایک ایک کرکے اپنے وجود کے تمام دروازے کھولتی چلی گئی۔ کبھی تو کسی کے آگے ہارنا ہی تھا۔ وہ عالم جنون میں ہارتی چلی گئی۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا؟ جب سر سے اونچا ہونے والا پانی نیچے اترا تو کچھ ہوش آیا۔ کچھ حواس بجا ہوئے تو وہ اس کے بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ وہ اسے تھپکنے لگا۔ پیار سے سہلاتے ہوئے تسلیاں دینے لگا۔ "تمہیں رونا چاہئے۔ تمہارے اندر جو تھوڑی سی اجنبیت رہ گئی ہے۔ وہ ان آنسوؤں سے دھل جائے گی۔ پھر میں مکمل طور پر تمہیں اپنا لگوں گا۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا؟"

"جو ہو گیا' اسے ہونا ہی تھا۔ آج نہ ہوتا تو کل ہوتا۔ کل نہ ہوتا تو کسی اور دن ہوتا۔ یہ تو اچھا ہی ہے جو ہوا بڑے پیار سے ہوا۔ اقرار سے ہوا۔ تم نے کبھی میری محبت کا اقرار نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود میں تمہارے اندر چھپا ہوا تھا۔ آج سے تم مجھ سے ہی منسوب رہنے کا اقرار کرتی رہو گی۔ تمہیں اپنا نام میرے نام کے ساتھ اچھا لگے گا۔"

وہ بڑے پیار سے اسے سمجھاتا مناتا رہا۔ پھر بولا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے' کچھ کھانے کے لئے ہوگا؟"

اس نے کھانے کی فرمائش کی تو اسے اچھا لگا۔ اب تو اسے اپنے مرد کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا خیال رکھنا تھا۔ جیسی زندگی گزارنے کے وہ خواب دیکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ویسی زندگی گزارنے والا آگیا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "ابھی لاتی ہوں۔"

وہ بستر سے اٹھ کر جانا چاہتی تھی پھر ٹھٹک گئی۔ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

سکندر نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "دوپہر کی ایک باسی روٹی اور مسور کی دال ہے۔"

"کوئی بات نہیں گرما گرم روٹی پکا دو۔"

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ سکندر نے اسے غور سے دیکھا پھر اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھرتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ ابھی کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ میری آغوش میں رہنا چاہتی ہو۔"

وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "ارے کیا ہوا؟ غزل میری جان! کیا بات ہے؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "گھر میں کچھ نہیں ہے۔ آپ نے دو ہزار دیئے تھے۔ انہیں اب تک بچا رکھا ہے۔ ابو کے آپریشن کے وقت بڑی رقم کی ضرورت پڑے گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اوہ گاڈ! تم نے ابھی مجھے بتایا تھا اور میں پیار کے نشے میں بھول گیا کہ تم بدترین حالات سے گزر رہی ہو؟"

وہ اس کی پیشانی کو چوم کر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "اب کبھی نہ رونا۔ میں آگیا ہوں۔ تم کسی بھی ذمے داری کا بوجھ نہیں اٹھاؤ گی۔ تمہارا سارا بوجھ میں اٹھایا کروں گا۔ ابھی رات کے گیارہ بجے ہیں۔ ہوٹل کھلے ہوں گے۔ میں سالن اور روٹیاں لے کر آتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ پھر کھانا لانے کے لئے باہر چلا گیا۔ بستر پر اس کی جگہ خالی ہو گئی۔ وہ اس طرف جھک گئی۔ اس خالی جگہ پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ اس جگہ کو خالی چھوڑنے والا اس کی زندگی میں لبالب بھر گیا تھا۔

اسے یقین ہو رہا تھا کہ اب اس گھر کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ وہ اسے سنبھالے گا۔ اس کے گھر کو بھی سنبھالے گا۔ اس نے سر جھکا کر اپنا چہرہ اس کے تکیے پر رکھ دیا۔ کسی نہ کسی پر تکیہ کرنا ہی پڑتا ہے اور وہ تکیہ کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

سب ہی کی زندگی میں ایسی راتیں آتی ہیں جو اندر اور باہر کی دنیا بدل دیتی ہیں۔

رت جگے حسین ہوتے ہیں۔ اندھیروں میں جو رونقیں ہوتی ہیں وہ دکھائی نہیں دیتیں' سمجھا دیتی ہیں۔ سکندر اپنی نیت سکندری سے جیتتا رہا اور وہ بڑے خلوص سے ہارتی رہی۔ یہ حاکم کی طرح ڈھالتا رہا وہ محکوم کی طرح ڈھلتی رہی۔ اس سے کترانے کے باوجود اس کی آغوش میں پگھلتی رہی۔ کثرتِ محبوبیت سے چُور چُور ہو کر بکھرتی رہی۔ یہ اس کی زندگی کے ایسے کمزور لمحات تھے جو اس کی سوچ بدل رہے تھے۔ وہ جسے گناہ سمجھتی تھی۔ اسے چاہت تصور کرنے لگی۔

انسان اور فرشتے میں خواہش کا ہی تو فرق ہوتا ہے۔ وہ فرشتہ نہیں تھی اس لئے خواہشات کے ریلے میں بہہ گئی۔ جس چور سے وہ نالاں تھی۔ اس کے پہلو میں رات گزر رہی تھی۔ اس کو اور اس کی ذمے داریوں کو سنبھالنے والا آچکا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بظاہر لاابالی نظر آنے والا یہ لڑکا اسے اتنی سنجیدگی سے قبول کرلے گا۔

صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ غزل کی نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ دس بج چکے تھے۔ اسے یاد آیا کہ ان دونوں کو ابو کے پاس اسپتال جانا تھا۔ وہ بستر سے اٹھنے لگی تو سکندر نے اسے کھینچ کر دوبارہ اپنی آغوش میں بھرلیا۔ اس نے خود کو چھڑانا چاہا مگر دل گرفتار رہنا چاہے تو آزادی بھلی نہیں لگتی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دن کے دو بج چکے تھے۔ اس نے سکندر کو جگایا۔ وہ اب بھی اٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ خود ایسی مدہوش ہو کر سوئی تھی کہ اسکول جانے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ اسکول سے آنے کے بعد اسپتال جانے والی تھی مگر اب اس کے ارادے بدلنے والا آگیا تھا۔ اب اس کی مرضی سے اس کے روز کے معمولات بدلنے والے تھے۔

اس نے دوبارہ سکندر کو اٹھانے کی کوشش کی۔ "سکندر! پلیز......... اٹھیں۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ہمیں اس وقت اسپتال میں ہونا چاہئے تھا۔"

وہ آنٹی کی پریشانی کا سن کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بالوں کو سمیٹتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔

وہ غسل کے دوران میں مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی۔ لڑکیاں جس کو زندگی کا ساتھی چن لیں تو ایک ہی پل میں اسے دور تک اپنے ساتھ ساتھ دیکھنے لگتی ہیں۔ وہ غسل سے فارغ ہو کر باہر آئی تو سکندر اسے بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔ جس طرح بارش کے بعد

چمکیلی دھوپ نکل آتی ہے۔ اسی طرح وہ نہانے کے بعد نکھری نکھری اور پاکیزہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بھیگے بدن کی خوشبو سحر پھونکتی ہے۔ وہ اس خوشبو کے سحر میں کھو سا گیا تھا۔ غزل نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ دیوانے ہوتے رہے تو دیر ہوجائے گی۔ فوراً نہا کر فریش ہوجائیں۔ میں کچھ کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔"

وہ اب اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے زبردستی سکندر کو غسل خانے میں دھکیلا اور خود کچن میں آگئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ ایسے میں ایک سوال پیدا ہوا' یہ کیسی خوشی ہے؟ جس میں اس کے گھر والے شریک نہیں ہیں۔ کسی کو خبر نہیں ہے اور وہ اس سے منسوب ہوچکی ہے۔

اسے احساس ہوا کہ اس نے گھر والوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ یوں احساس ہو تو ندامت ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے؟ مسرتوں کے ہجوم میں ندامت گم ہوجاتی ہے۔

رات سکندر کھانا زیادہ لے آیا تھا۔ اس نے اسی کو گرم کیا۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر کھانا لے کر کمرے میں آگئی۔

وہ اب تک غسل خانے میں تھا۔ اس کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ "آپ لڑکیوں کی طرح اتنی دیر سے نہا رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ جلدی باہر آئیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بالوں کو تولیے سے خشک کرتا سیٹی بجاتا ہوا باہر آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ غزل اس کے خوش ہونے کی وجہ سے دل ہی دل میں شرما گئی۔ انہوں نے کھانے اور چائے پینے کے بعد دروازے پر تالا لگایا پھر اسٹاپ کی طرف چل دیئے۔ اس وقت غزل کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے مجازی خدا کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہ احساس اس کے دل میں خوشیاں بھر رہا تھا۔ وہ قدم زمین پر رکھ رہی تھی مگر ہوا کے دوش پر چل رہی تھی۔

وہ اسپتال پہنچے تو دو ڈاکٹرز ابو کے بیڈ کے آس پاس تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس کی امی نے بتایا' یہ ڈاکٹرز کے راؤنڈ کا وقت ہے۔ یہ ایک ایک کرکے تمام مریضوں کی طبیعت دریافت کرتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر نے اپنے سینئر سے کہا۔ "سر! میرے خیال سے ان کا مائنر آپریشن دو دن بعد کر دیا جائے۔"

سینئر ڈاکٹر نے کہا۔ "مزید کچھ دن آبزرو کیا جائے۔ ہو سکتا ہے انہیں آلے کی ضرورت نہ پڑے۔"

غزل اور اس کی امی شروع سے ہی دعائیں مانگ رہی تھیں کہ گلے میں مصنوعی آلہ نہ لگے تو بہتر ہے۔ سانس کی دشواری تو ختم ہو جاتی ہے مگر اس آلے کی صفائی کے لئے بارہ ہزار کی مشین خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے اور مریض بھی باربار صفائی کے لئے پریشان ہونے لگتا تھا۔ اگر صفائی نہ کی جائے تو بلغم جمع ہونے کے باعث سانس رکنے لگتی ہے۔ انہوں نے اسپتال میں ایسے کئی مریض دیکھے تھے۔ جن کے گلے میں وہ آلہ مستقل طور پر لگا دیا گیا تھا۔ ان کی پریشانیاں دیکھتے ہوئے ماں بیٹی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہو۔

ڈاکٹر معائنے کے بعد چلے گئے۔ وہ تینوں بیڈ کے برابر بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئے۔ اس کی امی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

وہ ان کی نظروں کے سوال کو سمجھتے ہوئے بولی۔ "سکندر رات گھر آئے تھے۔ میں نے ابو کی حالت بتائی تو ان سے ملنے کے لئے میرے ساتھ چلے آئے۔"

وہ بولا۔ "مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ آپ لوگ اتنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ رات گھر گیا تو غزل نے حالات بتائے۔ صبح یہاں آنا تھا اسی لئے رات کو گھر پر ہی ٹھہر گیا۔"

اس کی بات سن کر غزل کی امی نے اس کے ابو کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ جوان لڑکے لڑکی نے تنہا ایک چھت کے نیچے پوری رات گزاری تھی۔ یہ تشویش کی بات تھی۔

اس کے ابو نے سکندر سے پوچھا۔ "تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"بس انکل! آپ بزرگوں کی دعائیں ہیں۔ ماشاء اللہ خوب ترقی ہو رہی ہے۔"

اس کی امی بولیں۔ "محنت کرو گے تو ترقی کیوں نہیں ہوگی؟ دن رات اسی میں مصروف رہتے ہو۔ ہم سے ملنے کے لئے بھی زبردستی وقت نکالتے ہو۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "میل ملاپ تو چلتا رہتا ہے۔ ابھی نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ جتنے میں وقت لگے گا۔ سارا وقت کاروبار کو دے گا تب ہی تو مستقبل سنوار سکے گا۔"

سکندر نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ نیا کاروبار پوری توجہ چاہتا ہے۔"

اس کے ابو سکندر کا مستقبل روشن دیکھ رہے تھے۔ دنیا کے تمام والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایسے شخص کو دیں جو اچھا کمائے اور بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھ سکے۔ کوئی بھی کمانے والا لڑکا سامنے آئے تو ماں باپ یہی سوچتے ہیں۔ پھر سکندر جیسے لڑکے کم ہی ملتے ہیں۔ اس کا اب آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ شادی کے بعد بیٹی ہی اس کی پوری کمائی کی حقدار ہوتی۔

جب سے بیماری نے انہیں دبوچا تھا۔ تب سے وہ غزل کی طرف سے پریشان رہنے لگے تھے۔ اس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ اکثر سوچتے رہتے کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان ماں بیٹی کا کیا ہوگا؟ سکندر کے آنے سے انہیں امید کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دونوں کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد رخصت ہو گئے تو غزل کی امی نے اس کے ابو سے پوچھا۔ "کیا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں جو میں سوچ رہی ہوں؟"

وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولے۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں سکندر کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں۔ اچھا لڑکا ہے۔ اگر اسے داماد بنا لیا جائے تو ہماری بیٹی بہت خوش رہے گی۔"

"اسپتال سے فرصت ہو جائے تو میں سکندر سے کسی نہ کسی بہانے یہ ذکر کروں گی۔ ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ہماری غزل کو پسند کرنے لگا ہے۔"

وہ دونوں سر جھکا کر سوچنے لگے۔ اگرچہ وہ رشتے کی بات سوچ رہے تھے لیکن یہ بات بھی کہیں چبھ رہی تھی کہ انہوں نے ایک ہی چھت کے نیچے رات گزاری ہے۔ جوان بیٹی سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس نے گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھال رکھی تھیں۔ اسے اب محض بیٹی سمجھ کر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بیٹا بھی بنی ہوئی تھی۔ اس پر بھروسا کئے بغیر زندگی کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی تھی۔

دھیمی دھیمی موسیقی، ملگجا اندھیرا اور طرح طرح کی خوشبوئیں ماحول کو رومانٹک بنا رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لفظوں کے ہونٹ سل گئے ہیں۔ صرف

نظریں کلام کر رہی ہیں۔ ان کے درمیان گفتگو نہیں ہو رہی تھی مگر نگاہیں اپنی بولی بول رہی تھیں۔

سکندر نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ مضبوط سہارے کا احساس اسے سرشار کر رہا تھا۔ ہر لڑکی کو ایسے سہارے کی تلاش رہتی ہے۔ اس کی تلاش ختم ہو چکی تھی۔ اسے اپنی منزل صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ منزل مل جانے کے تصور کے باوجود یہ اندیشہ دل میں ابھرتا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو' یہ سہارا چھن جائے؟ کوئی انہیں ایک دوسرے سے الگ نہ کر دے۔ ایسے ہی بہت سے وسوسے پیدا ہونے لگتے ہیں۔

اس کے دل میں بھی ایک اندیشے نے سر ابھارا۔ "اگر صنم ہرجائی ہو گیا تو کیا ہو گا؟" اس نے سکندر کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس طرح جیسے سیلاب کے ریلے میں بہنے والے کسی سہارے کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔

وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں نے اپنا سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ اب آپ ہی میرے مالک و مختار ہیں۔ میری حفاظت آپ کے فرائض میں شامل ہو چکی ہے۔ مگر پھر بھی دل ڈرتا ہے۔ اگر یہ ساتھ چھوٹ گیا تو کیا ہو گا؟"

"انکل کی بیماری کے باعث خاموش ہوں۔ ورنہ آج ہی ان کے آگے دامن پھیلا دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر لڑکی شادی کو ہی اپنی سیکیورٹی سمجھتی ہے۔ تم بھی یہی چاہو گی مگر حالات ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دے رہے۔ تم فکر نہ کرو جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے' میں سب سے پہلے انکل سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔"

اس نے غزل کے ہاتھ کو بڑے پیار سے دبایا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔ تب تک امی اور ابو میری ذمے داری ہیں۔ بیماری کی وجہ سے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ اسکول کی تنخواہ سے گزارہ مشکل ہو گیا ہے' میرے پاس ایک بہت اچھی جاب کی آفر ہے' میں آپ سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ کیا وہ آفر قبول کر لوں؟"

اس نے کچھ ناگواری سے پوچھا۔ "کیسی جاب ہے؟"

"نواب سعد اللہ جان بہت بڑے مل اونر ہیں۔ انہوں نے مجھے جاب کی پیشکش کی تھی کہ کبھی کوئی پریشانی ہو تو ملازمت کے لئے چلی آنا۔"

"میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی مل یا فیکٹری میں ملازمت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور سنو! اب تم اسکول کی ملازمت بھی چھوڑ دو گی۔ تمہارے تمام اخراجات میں پورے کروں گا۔ اپنی جان کی ساری پریشانی اپنے سر لے لوں گا۔"

وہ حکم دے رہا تھا مگر اس کا تحکمانہ انداز اسے تحفظ کا احساس دلا رہا تھا۔ انہوں نے رات کا کھانا اسی ریسٹورنٹ میں کھایا پھر وہ گھر آ گئے۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ ملن کی دوسری رات آ چکی تھی۔ وہ کمرے میں ایک دوسرے کی بانہوں کے سہارے کھڑے تھے کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

سکندر نے کہا۔ "تم ٹھہرو.......... میں دیکھتا ہوں۔"

وہ دروازہ کھولنے باہر گیا تو وہ بھی اپنا آنچل درست کرتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔ سکندر دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے وہی جیپ نظر آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے اندر آ کر غزل سے کہا۔ "سوری ڈیئر! اچانک مال کی سپلائی ہوئی ہے۔ مجھے فوراً گودام پہنچنا ہے۔"

"اتنی رات کو سپلائی..........؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میرا کام ہی ایسا ہے۔"

وہ جلدی میں نظر آ رہا تھا۔ دروازہ بند رکھنے کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔

وہ اسی کمرے میں آ گئی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے ان کی محبت کا سلسلہ جاری تھا۔ "رات کیسے کٹے گی؟" اس خیال سے ہی اسے وحشت ہو رہی تھی حالانکہ اس کی آمد سے پہلے بھی وہ تنہا رہ رہی تھی۔ عجیب شخص تھا۔ خلوت کو جلوت بنا دیتا تھا اور جلوت میں خلوت کے مزے دیتا تھا۔ اب اس نے تنہائی کو عذاب بنا دیا تھا۔

پا کر بھی تو نیند اڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

وہ بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ آنکھوں میں نیند نہ ہو تو بستر کی نرمی اور گرمی ستانے لگتی ہے۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ آگ لگ جائے تو کمبل یا ریت سے بجھائی جاتی ہے مگر یہ بھڑک اٹھے تو پانی کے سوا کسی چیز سے نہیں بجھتی۔

وہ شدت سے چاہ رہی تھی کہ گھٹا چھا جائے۔ خوب پانی برسے.......... اور ہر طرف جل تھل ہو جائے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر وہ جاگ رہی تھی۔ اچانک کسی نے دروازے کو پیٹ ڈالا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟"

دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ وہ ہمت کر کے صحن میں آئی۔ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے سکندر کی نحیف سی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔ غزل اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کے چہرے پر جا بجا نیل اور خراشوں کے نشانات تھے۔ وہ اسے سہارا دیتی ہوئی کمرے تک آئی۔ وہاں آتے ہی وہ بستر پر ڈھے گیا۔

غزل نے پریشانی سے پوچھا۔ "یہ کیا حالت ہوئی ہے؟ کسی سے جھگڑا کر کے آرہے ہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ جوتوں سمیت لیٹا ہوا تھا۔ غزل نے انہیں اتارا تو پیروں پر سوجن نظر آئی۔ غور کیا تو تلوؤں پر بھی نیل پڑے ہوئے تھے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر بات کیا ہے؟ اس نے پیروں کو چھوا تو سکندر کے حلق سے ایک کراہ نکلی جیسے ہاتھ لگانے سے اسے تکلیف ہوئی ہو۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ غزل اس کے سرہانے آکر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ گم صم ہو کر اسے تکے جا رہا تھا پھر اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ "پلیز غزل! مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ مجھے یہاں سکون ملے گا۔"

وہ التجا کر رہا تھا۔ وہ کیسے ٹال دیتی؟ اس کے ریشمی بازو سکندر کے لئے پناہ گاہ بن سکتے تھے۔ بیمار پہاڑوں پر جاتے ہیں۔ وہ اس کے جسم کی آب و ہوا میں آنا چاہتا تھا۔

اس نے تڑپ کر اسے سینے سے لگایا۔ سکندر کو جیسے قرار سا آگیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ سکون ملے تو نیند خود بخود مہربان ہو جاتی ہے۔

وہ ساری رات مسیحائی کرتی رہی۔ اسے سنبھالنے کے لئے اپنے بدن کا تعاون دیتی

رہی اور دل ہی دل میں اس کی صحت کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔

دن نکلا تو وہ چپکے سے کھسک کر بستر سے اٹھ گئی۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے باہر آگئی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ پہلے تو جدائی کی دھوپ میں جل کر جاگتی رہی تھی پھر جدائی ختم ہوئی تو قربت کی چھاؤں میں جاگتی رہی۔ نیند پوری نہ ہونے کے باعث سر بھاری ہو رہا تھا۔ چائے کی طلب نے ستایا تھا اس لئے کچن میں آگئی۔

وہ چائے بننے تک وہیں کھڑی سوچتی رہی' آخر سکندر کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے؟ وہ اتنی اذیت میں مبتلا ہے کہ چلا بھی نہیں جارہا۔ نہ جانے وہ یہاں کیسے پہنچا ہوگا؟ وہ کون ہے؟ جس نے اس کا یہ حال کر دیا ہے۔ اس حالت میں میری محبت اسے یہاں تک کھینچ لائی ہے' یہ خیال آتے ہی وہ خود پر فخر کرنے لگی۔

وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو سکندر بستر پر نہیں تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ جاگ گیا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی پھر واپس کچن میں آکر اس کے لئے ایک پیالی میں چائے ڈالنے لگی۔

کمرے میں آئی تو وہ جوتے پہن رہا تھا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ اس حالت میں کہاں جارہے ہیں؟"

"ضروری کام ہے۔ میرا جانا لازمی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں رات تک واپس آجاؤں گا۔" وہ جوتوں کے تسمے باندھتا ہوا بولا۔ پھر وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا اور ایک جیب سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر غزل کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کچھ رقم ہے۔ رکھ لو۔ بہ وقتِ ضرورت کام آئے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں بہت سے سوالات گردش کر رہے ہیں۔ واپس آکر میں ایک ایک کا جواب دوں گا۔"

وہ چائے کی پیالی اسے تھماتے ہوئے بولی۔ "آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے مگر یہ بتائیں اتنی ساری رقم کا میں کیا کروں گی۔"

"زندگی کا ہر دن انہی کاغذوں سے شروع ہو کر انہی پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور تم پوچھ رہی ہو کہ ان کا کیا کرو گی؟"

اس نے جلدی جلدی چائے حلق میں اتاری۔ غزل مزید کچھ کہنا چاہتی تھی' کچھ

پوچھنا چاہتی تھی مگر اس نے مہلت نہ دی۔ ہونٹوں پر ہونٹوں کی مہر لگ جائے تو الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

وہ جانے لگا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ تکلیف سے جان نکلی جا رہی تھی مگر جانا ضروری تھا۔ وہ اپنی جان کو کسی مسئلے میں الجھانا نہیں چاہتا تھا اس لئے رات کو آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

وہ ایک بار پھر تہی داماں ہوگئی۔

☆======☆======☆

بیگم ماہ لقا وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی بیڈ روم سے ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھیں۔ پچھلے دس برسوں سے وہ وہیل چیئر ان کا مقدر بن چکی تھی۔ ان کے دونوں پاؤں فالج زدہ ہوگئے تھے۔ دو ملازمائیں ان کی خدمت کے لئے دن رات موجود رہتی تھیں۔ انہیں بستر سے اٹھا کر اس چیئر پر بٹھاتیں اور اس وسیع و عریض کوٹھی میں ان کی مرضی کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھیں۔

وہ وہیل چیئر خود کار بھی تھی۔ ایک چھوٹی سی موٹر اس سے منسلک تھی۔ وہ تنہا بھی اس چیئر کو ڈرائیو کر سکتی تھیں چونکہ موٹر کی آواز گراں گزرتی تھی اس لئے خادمائیں انہیں اِدھر سے اُدھر پہنچاتی رہتی تھیں۔

انہوں نے خادمہ سے کہا۔ "ڈرائنگ روم میں لے چلو۔ نواب صاحب کا فون آنے والا ہے۔ گلنار کہاں ہے؟ پوری کوٹھی کو صاف ستھرا رکھنے کی ذمے داری اس کی ہے۔ پتا ہے' نواب صاحب کتنے نفاست پسند ہیں۔ ایک تنکا بھی کہیں دکھائی دے تو گرجنے لگتے ہیں۔"

وہ کوٹھی کے جس حصے سے گزر رہی تھیں' وہاں خادمائیں سر جھکائے ادب سے کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی ایک بڑی بیوہ بہن تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد اپنے بچوں کے ساتھ وہیں ٹھکانا بنا لیا تھا۔ نواب سعد اللہ جان کے ایک بھائی اسد اللہ جان تھے۔ وہ بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ جب بیگم ماہ لقا اپنے کمرے سے نکلتی تھیں تو وہ تمام رشتے دار ان کے آس پاس پروانوں کی طرح منڈلانے لگتے تھے اور اپنی کوششوں سے یہ اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے کہ وہ بیگم اور نواب صاحب کے چہیتے رشتے دار ہیں۔

سعد اللہ جان کسی کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ بیگم ماہ لقا کی ایک کمزوری تھی۔ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو جاتی تھیں۔ تمام رشتے دار اس کمزوری سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مصروف رہا کرتے تھے۔

ان کی ایک اور کمزری تھی۔ وہ اولاد سے محروم تھیں۔ شادی کے چھ برس تک انتظار ہوتا رہا کہ ان کی گود میں پھول کھلے گا پھران کا میڈیکل چیک اپ کرایا گیا۔ رپورٹ یہ نکلی کہ وہ بانجھ نہیں ہیں۔ ماں بن سکتی ہیں۔ تب ان کی بڑی بہن مہوش ان کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ نواب صاحب کا میڈیکل چیک اپ کرالیں۔

وہ اس بات کو ٹالتی رہیں۔ جب ان کا اصرار بڑھنے لگا تو ماہ لقا نے کہا۔ "آپا! آپ تو نواب صاحب کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ کسی حال میں اپنی توہین برداشت نہیں کریں گے۔"

"کیا میڈیکل چیک اپ کرانے سے توہین ہو جائے گی؟ کیا ساری عمر بے اولاد رہو گی؟ وہ تمہارے میاں ہیں ضد کرو گی تو مان جائیں گے۔"

"نہیں آپا! میں خود یہ نہیں چاہتی کہ وہ کبھی میرے سامنے شرمندہ ہوں۔ جب اولاد کی انہیں فکر نہیں ہے تو پھر میں کیوں ان پر دباؤ ڈالوں؟"

"سوچ لو! اتنی بڑی جائیداد ہے۔ اگر کوئی وارث نہ ہو گا تو نواب صاحب کے بعد ان کے چھوٹے بھائی کے بچے اس دولت پر راج کریں گے۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں جائیداد قریبی رشتے داروں کو ہی ملتی ہے اور وہ تو رہتے بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے ان کا ہی حق تسلیم کیا جائے گا۔"

ماہ لقا اپنی بہن کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئیں۔

انہیں سوچتا دیکھ کر مہوش بولیں۔ "کس سوچ میں گم ہو؟ ابھی وقت ہے' گزر گیا تو میری باتیں یاد آئیں گی۔ پھر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں تو تمہارے ہی فائدے کی بات کر رہی ہوں۔ آگے تمہاری مرضی۔"

"آپ کہتی تو ٹھیک ہیں مگر یہ بھی تو سوچیں کہ اگر رپورٹ پوزیٹو نہ آئی تو انہیں کتنی شرمندگی ہو گی؟ وہ تو اپنی سبکی برداشت نہیں کرتے یہ تو پھر شرمندہ کرنے والی بات ہو گی۔"

"ارے! تو تم انہیں یقین دلا دینا کہ رپورٹ جیسی بھی ہو گی۔ اس کا علم ڈاکٹر کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہو گا۔ یہ بات نواب صاحب' ڈاکٹر اور تمہارے درمیان رہے گی۔ تب تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔"

"آپ کا یہ مشورہ معقول ہے۔ عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ میں ہمت کر کے نواب صاحب سے بات کروں گی۔ دیکھیں! وہ کیا جواب دیتے ہیں؟"

مہوش نے ایسی بات کہہ دی تھی اور ماہ لقا سوچ میں پڑ گئی تھی کہ واقعی اگر اولاد نہ ہوئی تو تمام جائیداد کا کیا ہو گا؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بڑھاپا جوان اولاد کے سہارے گزرتا ہے۔ کاروبار کو سنبھالنے کے لئے کوئی تو وارث ہونا چاہئے' یہ خیالات انہیں پریشان کرنے لگے۔ انہیں اپنی عمر آخر کی فکر ستانے لگی۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب اسد اللہ جان کی بیگم یعنی ان کی بھاوج اکثر ماہ لقا سے کہتیں۔ "بھابی! آپ اولاد کے معاملے میں پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ ہمارے چار بچے ہیں۔ آپ جسے چاہیں گود لے لیں۔ لوگ یتیم خانوں سے دوسروں کے بچے گود لیتے ہیں۔ جبکہ ہماری اولاد نواب بھائی کا اپنا خون ہے۔ ان کا اسی خاندانی شجرے سے تعلق ہے۔"

"نہیں بھابی! میں کسی ماں کے کلیجے کو نوچ نہیں سکتی۔ اولادیں چاہیں دس ہوں۔ ان میں سے کسی ایک کو اٹھا کر یونہی کسی کی جھولی میں نہیں ڈالا جاتا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں؟ آپ ہمارے لئے غیر تو نہیں ہیں۔ میں تو صرف آپ دونوں کی محبت میں ایسا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے آپ کی تنہائی دیکھی نہیں جاتی۔ ورنہ کون ماں اپنے کلیجے کو خود سے علیحدہ کرنے پر راضی ہوتی ہے۔"

وہ محبت جتا رہی تھیں اور دل سے چاہتی تھیں کہ ان کا کوئی بچہ گود لے لیا جائے تو تمام جائیداد کا وارث وہی بنے گا۔ نواب صاحب تو ویسے بھی اولاد پیدا کرنے کی عمر سے گزر چکے تھے۔ بیمار رہنے لگے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں ان کا چل چلاؤ تھا۔ اس کے بعد ماہ لقا بیگم رہ جاتیں۔ شوہر اور اولاد کے بغیر اس نیام کی طرح ہوتیں جس میں سے تلوار نکال لی گئی ہو۔

دوسری طرف مہوش ان کے منصوبے کو کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی

تھیں کہ بہن کی دولت پر اسد اللہ اور ان کے بیوی بچے راج کریں۔ وہ نواب صاحب کا میڈیکل چیک اپ کرانا چاہتی تھیں تاکہ منفی رپورٹ ملنے کے بعد دوسری شادی کے ارادے سے باز رہیں اور ان کی بہن پر سوکن نہ آسکے۔ نواب صاحب ماہ لقا بیگم سے عمر میں دوگنے تھے۔ بیمار رہا کرتے تھے۔ مہوش کا خیال تھا کہ وہ ماہ لقا سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔

جو کرنا تھا نواب صاحب کی زندگی میں ہی کر گزرنا تھا۔ مہوش کی تمام ہمدردیاں صرف اپنی بہن کے لئے تھیں۔ وہ بہن کو متاثر کرکے اس کے دل میں جگہ بنالینا چاہتی تھیں تاکہ ان کے کسی بچے کو بہن کی گود میں جگہ مل جائے۔ ماہ لقا کسی بھی بچے کو اپنے کلیجے سے لگا کر نواب صاحب کو قائل کرسکتی تھیں اس بچے کو ان کا وارث بنا سکتی تھیں۔

ماہ لقا بیگم نہ کسی کے لینے میں تھیں' نہ کسی کے دینے میں۔ مہوش بیوہ ہوئیں تو ان کے بچوں پر ترس کھا کر انہیں اپنے ساتھ کوٹھی میں رکھ لیا۔ نواب صاحب بھی خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ یوں مہوش کا وہاں مستقل ٹھکانا بن گیا۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب اسد اللہ جان پہلے سے وہاں رہ رہے تھے۔ مہوش کے آنے پر کچھ بولے تو نہیں بس زیر لب بڑبڑا کر رہ گئے کہ بھائی کا گھر یتیم خانہ بن گیا ہے۔ سب ایک دوسرے سے منہ دیکھے کی محبت کر رہے تھے۔ ایک چھت کے نیچے رہنے کے باوجود دلوں میں ہزاروں کدورتیں تھیں۔

نواب سعد اللہ جان اور ماہ لقا بیگم کی شادی کو ساتواں سال ہونے والا تھا مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ایک دن بیگم ہمت کرکے بولیں۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ زندگی کی ایسی کوئی خوشی نہیں ہے جو آپ نے میرے دامن میں نہ ڈالی ہو۔ آپ سے جو خوشیاں مجھے نصیب ہوئی ہیں' وہ بہت کم ہی کسی کے حصے میں آتی ہوں گی۔"

انہوں نے کہا۔ "ہم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ آپ وہ واحد لڑکی تھیں جنہوں نے ہمارے دل کی دنیا کا سارا نظام بدل ڈالا تھا۔ ہم ہمیشہ شادی سے کتراتے تھے۔ اسے ایک عذاب سمجھتے تھے۔ آپ سے مل کر اس عذاب میں مبتلا ہونے کی قسم کھا بیٹھے اور آپ کو اپنی زندگی میں لاکر ہی دم لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اصل زندگی اور اس کی

خوشیاں تو شادی کے بعد ہی نصیب ہوتی ہیں۔ آپ کو پاکر ہم خود کو مکمل سمجھنے لگے ہیں۔

"جس طرح زندگی گزارنے کے لئے شریکِ حیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح میاں بیوی کے رشتے کی مضبوطی کے لئے اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اولاد کا ذکر سنتے ہی نواب صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔ وہ بولے۔ "اولاد نہ ہونے سے اس رشتے کی پائیداری ختم نہیں ہوجاتی اور اس کا ثبوت ہم دونوں کی محبت ہے' اور جہاں تک اولاد کا تعلق ہے تو ہم اس محرومی کو برداشت کر رہے ہیں پھر آپ کیوں اپنے دماغ پر بوجھ ڈالتی ہیں؟ آپ میں کوئی خامی نہیں ہے۔ اگر نصیب میں اپنا بچہ ہے تو ہوجائے گا۔"

"یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ میری رپورٹ پازیٹو ہیں۔ میں بانجھ نہیں ہوں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اولاد سے محروم ہیں؟"

وہ ہچکچا رہی تھیں۔ کھل کر کہہ نہیں پارہی تھیں۔ اپنی خواہش کا اظہار دبے لفظوں میں کر رہی تھیں۔ انہوں نے ان سے اولاد نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو نواب صاحب نے ان کی توقع کے خلاف کہا۔ "خدا کے بھید وہی جانتا ہے۔ اس کے ہر عمل میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ہمارے اولاد نہیں ہے۔ جانے اس میں بھی اس کی کیا مصلحت ہے؟"

وہ جو کہنا چاہتی تھیں۔ نواب صاحب اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگیں۔ "آپ نے میری ہر خواہش کا احترام کیا ہے۔ کبھی میرا مان نہیں توڑا مگر آج جس خواہش کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ وہ شاید آپ کو ناگوار گزرے؟"

"جب آپ یہ جانتی ہیں کہ ہم نے کبھی آپ کی کوئی بات مسترد نہیں کی تو پھر آج یہ تمہید کس سلسلے میں باندھی جارہی ہے؟ کھل کر بات کریں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "میں چاہتی ہوں کہ.......... وہ.......... میرا مطلب ہے کہ.......... آپ میرے کہنے پر.......... ایک بار.......... اپنا معائنہ کروالیں۔ یقین کریں' یہ بات میرے آپ کے اور ڈاکٹر کے درمیان رہے گی۔ شاید بہتری کی کوئی راہ نکل آئے۔"

وہ سخت لہجے میں بولے۔ "کیا ہمارے پاس عقل نہیں ہے؟ کیا ہم نہیں سمجھتے کہ ہمیں اپنا چیک اپ کرانا چاہئے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے مرد پر اپنے مجازی خدا پر

چھوڑ دی جاتی ہیں۔ آپ یہ معاملہ ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"خدارا! آپ ناراض نہ ہوں۔ اگر یہ بات آپ کو گراں گزری ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں' آئندہ ایسی خواہش کا اظہار نہیں کروں گی۔"

انہوں نے اس خواہش کو ہمیشہ کے لئے اپنے سینے میں دفن کردیا۔ پھر وہ حادثہ پیش آیا جس نے وہیل چیئر کو ان کا نصیب بنا دیا۔ فالج کے اچانک حملے نے انہیں دونوں ٹانگوں سے مفلوج کر دیا تھا۔

معذوری کے بعد بیگم نے نواب صاحب کو ایک بار مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرلیں۔ وہ اس بات پر بہت ناراض ہوئے۔

"آپ ایک سوکن لانے کی بات کس دل سے کہہ رہی ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "میں صرف سوکن پر اعتراض کروں گی تو یہ میری خود غرضی ہوگی۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں مجھ سے ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہوسکیں گے۔ ایک امید بندھی ہوئی تھی کہ کبھی اولاد ہوگی۔ اب اس امید نے بھی دم توڑ دیا ہے۔ آپ مجھ سے فیض حاصل نہیں کرسکیں گے۔"

"فیض حاصل نہ ہوسکے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آپ کی برسوں کی محبتوں اور وفاداریوں کو بھلا دیں اور گھر کی کسی ناکارہ چیز کی طرح آپ کو گھر کے اسٹور روم میں ڈال کر بھول جائیں۔ آپ آج بھی ہمارے لئے اتنی ہی اہم ہیں جتنی شادی کی پہلی رات کو تھیں۔"

"مجھے فخر ہے کہ آپ مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہیں۔ اسی یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ سوکن کے آنے سے میری قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ ہمیں جذبات سے بالاتر ہوکر یہ سمجھنا ہوگا کہ اولاد اہم ہے۔ آپ کا ایک وارث ہونا چاہئے۔"

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ہماری بہتری کے لئے سوچتی ہیں اور ہماری آئندہ نسل کی خاطر ایک سوکن کو برداشت کرنا چاہتی ہیں لیکن ہم مقدر سے نہیں لڑسکتے۔ اگر دوسری سے بھی اولاد نہ ہوئی تو..........؟"

اس سوال کا جواب بیگم کے پاس نہیں تھا۔ وہ باپ بننے کے قابل ہیں یا نہیں یہ صرف خدا جانتا ہے۔ انہوں نے اپنا چیک اپ کرایا تھا اور نہ ہی کرانا چاہتے تھے لہٰذا اولاد

کے سلسلے میں بحث نہیں کی جاسکتی تھی۔

بیگم کے اپاہج ہوجانے کے باعث نواب صاحب کی محبت میں شدت آگئی تھی۔ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت دینے لگے تھے۔ اکثر انہیں تازہ ہوا کے لئے لان میں لے آتے تھے۔ یوں تو دو ملازمائیں دن رات ان کی خدمت پر مامور رہتی تھیں مگر ایسے وقت جب وہ تنہا ہوتے تو بیگم کی وہیل چیئر کو خود دھکیلتے۔

ابتدا میں بیگم یہی سوچتی رہتیں کہ کہیں نواب صاحب ان سے اکتا نہ جائیں۔ ان کی محبت میں کمی نہ آجائے۔ ایسے بہت سے خیالات ان کے دل میں ابھرتے رہتے تھے۔ مگر ان کے مفلوج ہوجانے کے بعد نواب صاحب کی بڑھتی ہوئی چاہت نے ان کی یہ غلط فہمی دور کردی۔

ماہ لقا بیگم کے معذور ہوجانے کے بعد اسد اللہ اور ان کی بیگم کا اصرار بڑھ گیا کہ ان کا بچہ بھائی کے زیر سایہ پرورش پائے۔ اب چونکہ اولاد ہونے کی رہی سہی امید بھی ختم ہوچکی تھی لہٰذا اسد اللہ کی بیگم کسی نہ کسی بہانے ماہ لقا سے اس موضوع پر ضرور کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھیں۔

دوسری طرف مہوش بہن کے اپاہج ہونے سے پریشان رہنے لگیں۔ ان کے دل میں یہ کانٹا چبھنے لگا کہ کسی دن نواب صاحب دوسری شادی نہ کرلیں؟ دولت ہو تو جوانی اور بڑھاپے کا فرق بے معنی ہوجاتا ہے۔ کوئی بھی عورت ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوسکتی تھی۔

نواب صاحب بیمار رہتے تھے مگر بظاہر صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ بہترین خوراک نے انہیں اس عمر اور بیماری کے باوجود سنبھالا ہوا تھا۔ کبھی کبھی بیماری میں شدت آجاتی تو بڑی خاموشی اور حوصلے سے اسے برداشت کرتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ بیماری کی شدت ظاہر نہ ہو۔ لوگ انہیں بوڑھا اور کمزور نہ سمجھیں۔

دس برس کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود نواب صاحب نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ ہی کسی کی اولاد کو گود لیا۔

اسد اللہ اس بات سے وقتی طور پر دل برداشتہ ہوگئے کہ ان کے بچے کو گود نہیں لیا جارہا ہے۔ ویسے سعد اللہ کی ڈھکی چھپی بیماری انہیں مطمئن کررہی تھی۔ ان کے بعد

جائیداد کے بٹوارے میں بھائی ہونے کے ناتے پوری جائیداد کے وہی حقدار ہوں گے۔

دوسری طرف ماہ لقا کی بیوہ بہن مہوش یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ اگر نواب صاحب نے دوسری شادی کرلی تو ان کا اور ان کے بچوں کا کیا ہوگا؟ نہ جانے آنے والی ان کا وجود کوٹھی میں برداشت کرے یا نہ کرے؟ اگر انہیں یہاں سے نکالا گیا تو ان کے پاس کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔

خادمہ ماہ لقا بیگم کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

مقررہ وقت پر فون کی گھنٹی بجی۔

بیگم نے ریسیور کان سے لگایا پھر بولیں۔ "آداب! کیسے مزاج ہیں؟"

دوسری طرف سے سعد اللہ جان کی پیار بھری رعب دار آواز سنائی دی۔ "آپ تو فون کی گھنٹی سنتے ہی سمجھ لیتی ہیں کہ ہم نے آپ کو مخاطب کیا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "فون سے پہلے آواز دل تک پہنچ جاتی ہے۔ اب آپ فیکٹری سے نکل رہے ہیں۔ میرے پاس آ رہے ہیں۔"

"آپ سے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ کہنے سے پہلے ہی سمجھ لیتی ہیں۔"

"آپ روبرو ہوتے ہیں تو آپ کے بولنے کا انداز ہمیں سمجھا دیتا ہے کہ آپ کیا بولنے والے ہیں؟"

"آپ نے ہمیں اور ہمارے مزاج کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ ہمیں خود اپنی پسند پر فخر ہے۔ اچھی بیگمات خوش نصیبوں کو ملتی ہیں۔"

"خوش نصیبی میں تو میں بھی آپ سے کم نہیں ہوں۔ آپ جیسے خاوند مقدر والیوں کو ملتے ہیں؟"

وہ دونوں روبرو ہوں یا فون پر ہوں۔ اسی طرح ایک دوسرے کی محبت میں ڈوب کر بولتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت زیادہ مٹھاس ہو تو اس کے پیچھے کہیں تلخی چھپی ہوتی ہے۔ اسی تلخی سے انکار کرنے کے لئے شعوری یا لاشعوری طور پر زیادہ مٹھاس گھولی جاتی ہے۔

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں پہنچنے والے تھے۔ مہوش اور ان کے بچے، اسد اللہ جان اور ان کی بیگم اور بچے ایسے وقت صاف ستھرے لباس پہن کر

ڈرائنگ روم میں ان کا انتظار کرتے تھے۔ یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ تمام دن ان کے منتظر رہتے ہیں۔

نواب صاحب نے ماہ لقا سے کہا تھا۔ "آپ ان رشتے داروں کی بھیڑ میں نہ رہا کریں۔ ہم ان سے نمٹ کر فوراً آپ کے بیڈ روم میں آیا کریں گے۔"

یہ ان کی چاہت کا انداز تھا۔ وہ بیڈ روم کی تنہائی میں آکر انہیں گلے لگاتے اور چومتے تھے۔ ایک اپاہج بیوی کو اتنا پیار دیتے تھے کہ وہ مسرتوں سے سرشار رہتی تھیں۔

وہ بڑے پیار سے سوچنے لگیں۔ "آج کل نواب صاحب کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ پتا نہیں کیا سوچتے رہتے ہیں؟ میں نے ایک بار پوچھا بھی تھا لیکن وہ طرح دے گئے تھے۔ بڑی محبت سے ٹال دیا تھا۔

کوئی بات تھی، جسے وہ سب سے چھپا رہے تھے۔ ماہ لقا کو تشویش تھی کہ اس سے کیوں چھپا رہے ہیں؟ پھر وہ خود کو تسلیاں دینے لگتی تھی کہ کاروباری الجھنیں ہوں گی۔ اگر کوئی ذاتی معاملہ ہوتا تو وہ کوئی بات ان سے نہ چھپاتے۔

وہ اسی طرح دیر تک سر جھکائے ان کے بارے میں سوچتی رہیں پھر ایک ملازم کی آواز سن کر چونک گئیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں آکر کہہ رہا تھا۔ "حضور نواب صاحب تشریف لے آئے ہیں۔"

بیگم نے آس پاس رشتے داروں کی بھیڑ دیکھی۔ وہ سوچ میں ایسی گم ہوئی تھیں کہ بیڈ روم جانا بھول گئی تھیں۔ انہوں نے خادمہ کو دیکھا۔ اس سے کہنا چاہتی تھیں کہ بیڈ روم میں لے چلے لیکن ایسا کہنے سے پہلے ہی نواب صاحب وہاں آگئے۔

سب ہی ادب سے سر جھکا کر انہیں سلام کرنے لگے۔ وہ سب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیگم کے پاس آئے۔ "آپ اتنی بھیڑ میں کیا کر رہی ہیں؟ بیڈ روم میں آرام کرنا چاہئے۔"

اسد اللہ جان نے کہا۔ "میں نے بھابی جان سے کہا تھا، انہیں آرام کرنا چاہئے مگر یہ تنہا وہاں رہ کر پریشان ہوجاتی ہیں۔"

مہوش نے کہا۔ "پریشان ہوں ان کے دشمن۔ میں بڑی بہن ہوں۔ ان کا دل بہلاتی رہتی ہوں۔"

اسد اللہ جان کی بیگم جلدی سے بولیں۔ "آپ ہمیں دشمن کہہ رہی ہیں؟ کیا ہم بھابی جان کا دل نہیں بہلاتے؟"

اسد اللہ جان نے کہا۔ "چھوڑو بیگم! ان کے منہ نہ لگو۔ یہ جیسی بھی ہیں۔ ہماری بزرگ ہیں۔ بھابی جان کی بڑی بہن ہیں۔ ہمارے لئے محترم ہیں۔"

"واہ کیا خوب؟ میرا احترام بھی کر رہے ہیں اور میرے منہ نہ لگنے کی بات بھی کہہ رہے ہیں۔ آپ ایسی دوغلی باتیں کر کے مجھے میرے بہنوئی کی نظروں سے گرا نہیں سکیں گے۔"

جواب میں اسد اللہ کی بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ نواب صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔

"خاموش رہو۔ ہزار بار سمجھایا ہے' ہمیں تُو تُو مَیں مَیں پسند نہیں ہے۔ آخری بات سمجھاتے ہیں۔ انسانوں کی طرح رہو یا پھر بوریا بستر باندھو اور یہاں سے جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ماہ لقا کے اور قریب آئے۔ خادمہ ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے بیگم کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے بیڈ روم کی طرف جانے لگے۔

ان کا یہ انداز بیگم کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتا تھا۔ وہ اتنی باوقار شخصیت کے مالک ہو کر ان کی چیئر کو دھکیلتے ہوئے لے جاتے تو رشتے داروں اور ملازمین کے سامنے بیگم کی گردن فخر سے تن جاتی تھی۔ وہ خود کو سب سے خوش نصیب سمجھنے لگتی تھیں۔ ایسے چاہنے والے شوہر جو بیوی کی معذوری کو نظرانداز کر دیتے ہیں' کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔

وہ دونوں بیڈ روم میں آ گئے۔ نواب صاحب نے وہیل چیئر کو ایک صوفے کے پاس روکا پھر اس صوفے پر بیٹھ کر بیگم کا ہاتھ تھام کر بولے۔ "ان رشتے داروں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ نامعلوم یہ تمام دن آپ کو کتنا پریشان کرتے ہوں گے؟"

وہ بولیں۔ "رشتے دار جیسے بھی ہیں۔ ہمارے اپنے ہیں۔ پریشانی تو ہوتی ہے لیکن محبتیں بھی ملتی ہیں۔ آپ ان کی نہیں اپنی بات کریں۔ میں پچھلے دو ماہ سے آپ میں تبدیلیاں دیکھ رہی ہوں۔"

"کیا آپ نے ہمارے اندر جھانکنے کا ہنر بھی سیکھ لیا ہے؟"

"بات کو مذاق میں نہ ٹالیں۔ آج کل آپ کسی گہری سوچ میں گم صم سے رہتے

ہیں۔ میں انتظار کرتی رہتی ہوں کہ آپ اپنا کوئی مسئلہ بیان کریں گے مگر یہ میری خوش فہمی ہے' آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟"

"آپ اتنی قابل ہیں کہ ہمارے دل میں سمائی رہتی ہیں۔ بے شک ایک مسئلہ ہے۔ ہم کشمکش میں ہیں کہ آپ کے سامنے کس طرح زبان کھولیں؟"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ایسی بھی کیا بات ہے کہ آپ ہم سے کھل کر کہنے سے ہچکچاتے رہے ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ بیگم انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ آخر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگے۔ "بات یہ ہے کہ ہم نے اپنا میڈیکل چیک اَپ کرایا تھا۔"

انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا واقعی.........؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولے۔ "ہاں......... رپورٹ مثبت ہے۔ ہم باپ بن سکتے ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولیں۔ "یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے مگر آپ فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔"

وہ صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ "ہم کشمکش میں ہیں۔ جب سے یہ رپورٹ ملی ہے' ہمارے اندر اولاد کی خواہش مچلنے لگی ہے۔"

"اُف خدایا! آپ تو ہمیں مسرتوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔ اب تو ایک نہیں' آپ کے کئی نام لیوا پیدا ہوں گے۔ آپ کی آئندہ نسلیں پھلتی پھولتی رہیں گی۔ یہاں مجھے بھی امی کہنے والی اولادیں ہوں گی۔"

انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔ "وارث ہمارا پیدا ہوگا اور خوشی سے آپ باولی ہو رہی ہیں۔ کیا یہ بھول رہی ہیں کہ یہاں آپ کی ایک سوکن آئے گی؟"

"میں نے بہت پہلے دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔ مجھے کسی سوکن سے کوئی اندیشہ نہیں ہے کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ کسی نئی کے سامنے مجھے پرانی نہیں سمجھیں گے۔ دونوں کے ساتھ انصاف کریں گے۔"

نواب سعد اللہ جان نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ "یہ آپ کے وفا شعار ہونے کا ثبوت ہے۔ آپ ہم پر اندھا اعتماد کرتی ہیں۔ آپ کے اعتماد نے ہماری مشکل آسان کردی

ہے۔"

"اس میں کیا مشکل تھی؟ کیا آپ کو دوسری شادی سے کوئی روک سکتا ہے؟ ہرگز نہیں.......... اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا آپ کا حق ہے۔ آپ دنیا والوں کی پرواہ نہ کریں۔ یہ بتائیں کہ کوئی لڑکی دیکھی ہے؟"

ان کی نگاہوں میں ایک چہرہ گھومنے لگا جو انجانا بھی تھا اور جانا پہچانا بھی۔ اسی مورت نے حسن کی مورت نے چند گھنٹوں کی ملاقات میں ان کے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔

تین ماہ گزر چکے تھے پھر دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی یادیں تھیں کہ دستک دیئے بغیر دل میں گھسی چلی آتی تھیں اور تصور میں اتنی واضح دکھائی دیتی تھیں کہ جیسے حقیقت میں سامنے آگئی ہو۔

کیا ادائیں تھیں! کیا بانکپن تھا! تھوڑی سی جوانی تھی۔ تھوڑا بچپن تھا۔ دور سے دیکھو تو کہانی تھی، رگِ جاں کے قریب آجائے تو ایک اٹل سچائی تھی جو دل میں ہلچل مچاتی رہتی تھی۔

ہائے غزل! تم کہاں ہو؟

تین ماہ میں تین مشاعرے ہوئے مگر وہ محفلِ سخن میں نہیں آئی۔ وہ خواب کی طرح آنے والی جانے کہاں سے آئی تھی؟ وہ تعبیر کو ترسانے والی کہاں گم ہوگئی تھی؟

بیگم کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

"آں.......... وہ.......... وہ سوچنا کیا ہے؟ کسی اچھی شریف زادی سے نکاح پڑھانا ہے۔"

ماہ لقا نے کہا۔ "سید انوار الحق کی صاحبزادی شادی کے تین برس بعد بیوہ ہوگئی تھیں۔ آپ اجازت دیں تو میں ان سے رشتے کی بات چلاؤں۔"

انہوں نے گھور کر لقا کو دیکھا پھر سخت لہجے میں بولے۔ "آپ کیا فرما رہی ہیں؟ ہم کسی بیوہ سے شادی کریں گے؟ آپ ہمیں کسی کا جھوٹا کھانے کو کہہ رہی ہیں؟"

بیگم ماہ لقا ایک ذرا سی بوکھلا گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ایک بیوہ کو ان سے منسوب کیا جائے گا تو وہ اس میں اپنی توہین کا پہلو نکال لیں گے۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "معافی چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ آپ

عمر رسیدہ ہیں۔ کسی کنواری کا رشتہ شاید نہ ملے۔"

"عمر رسیدہ؟" انہوں نے بپھر کر پوچھا۔ "کیا ہم بوڑھے ہو چکے ہیں؟ کیا ہماری کمر جھک گئی ہے؟ ہم چھڑی ٹیک کر نہیں چلتے بلکہ رعب اور دبدبہ قائم رکھنے اور شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لئے چھڑی ہاتھ میں لے کر چلتے ہیں۔"

"خدارا! آپ ناراض نہ ہوں۔ کسی کنواری سے شادی کی بات چلے گی تو لڑکی والے آپ کی عمر کا حساب کریں گے۔ آپ ستر کے عشرے میں ہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ دوسروں کے سوال و جواب پر ابھی سے غور فرمائیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ بات طمانچے کی طرح لگ رہی تھی کہ انہیں بوڑھا سمجھا جارہا ہے اور یہ کہ لڑکی والے ان کے بڑھاپے کا حساب کریں گے۔

وہ جانے لگے تو ماہ لقا نے پوچھا۔ "آپ ناراض ہو کر جارہے ہیں؟"

"ہارنے والے اور جھکنے والے ناراض ہوتے ہیں، ہم جھکنا نہیں جانتے، ہم کسی کو اپنی عمر کا حساب نہیں دیں گے۔ جسے چاندی کا جوتا ماریں گے وہ سر جھکا کر اپنی بیٹی کا رشتہ ہمیں دے دے گا۔"

وہ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بڑی دیر سے بھری بیٹھی تھیں۔ شوہر کی خوشی کے لئے ایک سوکن کو برداشت کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اندر آگ نہیں لگی ہے۔

انہیں یہ حقیقت بھی رُلا رہی تھی کہ وہ محض اولاد کی خاطر نہیں، عیاشی کی خاطر کنواری لڑکی لانا چاہتے ہیں۔

وہ ان کی گزشتہ زندگی سے بخوبی واقف تھیں۔ انہوں نے تمام جوانی عیاشیوں میں گزاری تھی۔ پینتالیس برس تک شادی سے کتراتے رہے۔ ان کے والد اسی فکر میں گھلتے رہے کہ عیاش بیٹے کا کیا بنے گا؟ ان کی نسل کیسے آگے بڑھے گی؟

انہوں نے تھک ہار کر پہلے اپنے چھوٹے بیٹے نواب اسد اللہ جان کی شادی کردی تاکہ گھر میں پوتے پوتیوں کی آوازیں سن سکیں۔

وہ بڑے بیٹے نواب سعد اللہ جان کی طرف سے پریشان رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صاحبزادے گھر سے باہر کیا کرتے ہیں مگر جوان بیٹے کو روک ٹوک نہیں سکتے تھے۔ کسی بھی

حیلہ حوالے سے شادی کی زنجیر میں جکڑ دینا چاہتے تھے۔ صاحبزادے کی بے راہ روی نے انہیں دل کا مریض بنا ڈالا تھا۔

سعد اللہ جان نے ماہ لقا کو ایک تقریب میں دیکھا تو دل ہار گئے۔ پہلی بار ان کے دل میں کسی کو چاہنے اور تاحیات اپنا بنا لینے کا جذبہ پیدا ہوا۔ انہی دنوں ان کے والد صاحب پر دل کا دوسرا دورہ پڑا۔ جب ان کی طبیعت سنبھل گئی تو سعد اللہ کو بلا کر کہا۔ "بیٹے! ہماری زندگی سردی کی دھوپ بن چکی ہے۔ بہت جلد آنگن کی دیوار سے سرک جائے گی۔ ہم تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کے متمنی ہیں۔ خدارا! انکار نہ کرو۔ اسے ہماری آخری خواہش جان کر پورا کردو۔"

سعد اللہ کو ماہ لقا پسند آگئی تھی لہٰذا انہوں نے اپنے والد کی یہ خوشی پوری کردی۔ شادی کے بعد ماہ لقا بیگم کو ان کی عادتوں کا علم ہونے لگا۔ ان کے مزاج میں گرمی نہیں تھی اس لئے صبر کرتی رہیں۔ یہ سوچ کر ان کی تسلی ہوجاتی تھی کہ وہ باہر جیسا بھی وقت گزارتے ہوں لیکن گھر میں ایک شوہر کی حیثیت سے بھرپور محبت دیتے تھے۔ اپنا مرد محبت کا چارہ ڈالتا رہے تو اس کا جھوٹ اور فریب برداشت ہوجاتا ہے۔

موم بتی کو ایک طرف سے جلنا چاہئے۔ اسے دونوں طرف سے جلایا جائے تو وہ تیزی سے پگھل جاتی ہے۔ سعد اللہ جان نے جوانی کو بڑی تیزی سے خرچ کیا۔ اب تقریباً ستر برس کے ہونے والے تھے۔ باہر سے وہ چلتے پھرتے صحت مند دکھائی دیتے تھے مگر اندر سے بڑھاپے کے حملے جاری تھے۔

کھانسی اور دمے کے باعث وہ دو چار سیڑھیاں چڑھتے ہی ہانپنے لگتے تھے۔ ایسے میں ہوس تھی کہ پہاڑی پر چڑھیں گے۔ آج تک کسی فرہاد نے کھانستے' بلغم تھوکتے' ہانپتے اور کانپتے کبھی دودھ کی نہر نہیں نکالی مگر وہ نکالنا چاہتے تھے۔

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ملازم نے آکر کہا۔ "حضور! شاعر ہمنوا صاحب تشریف لائے ہیں۔"

خوشی سے سعد اللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ غزل کی کوئی خبر ملنے والی تھی۔ غزل کی باتیں چھیڑی جانے والی تھیں۔

دل نے پھڑک کر کہا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ ہمنوا نے صوفے سے اٹھتے ہوئے مصافحہ کیا۔ نواب صاحب انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ "گزشتہ محفلِ سخن میں آپ کی کمی سب ہی نے محسوس کی۔"

"بس نواب صاحب کیا پوچھتے ہیں؟ میرا تو وہی حال ہے کہ..........

ہر زخم میں ڈوب کر ابھرنا ہے مجھے
ہر تجربۂ غم سے گزرنا ہے مجھے
ہر درد کا ذائقہ ہے چکھنا لازم
دستورِ نشاط وضع کرنا ہے مجھے"

"کیا بات ہے ہمنوا صاحب! بڑے اداس شعر سنائے ہیں لیکن مایوس کن نہیں ہیں۔ عزم اور حوصلے کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔"

"شاعری کا معاملہ دل سے ہوتا ہے۔ یہ جو رباعی میں نے آپ کی نذر کی ہے۔ میری نہیں ہے۔ یہ احمد ندیم قاسمی کی ہے۔ میں تو غم حیات کے گرداب میں ایسا گرفتار ہوا ہوں کہ کوئی نیا شعر بھی نہ کہہ سکا۔ اسی لئے مشاعرے میں بھی شرکت نہ کرسکا۔"

"سب ہی کو اپنا اپنا غم بھاری لگتا ہے' اپنی پریشانی عذاب لگتی ہے۔ آپ کی طرح ہم بھی پریشان ہیں۔ یہ پریشانیاں کسی کو نہیں چھوڑتیں۔"

وہ بولتے بولتے کسی سوچ میں گم ہوگئے۔ ہمنوا نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ پریشان ہیں؟"

"شاہوں اور شہنشاہوں کو بھی فکریں کھاتی ہیں۔ آپ اپنی پریشانی بیان کریں۔"

"میرا چھوٹا بیٹا ولید گزشتہ ایک ہفتے سے اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ صاحبزادے کے دل میں ایک ہلکا سا اسپاٹ ہے۔"

"جی ہاں! ہمیں معلوم ہے۔ آپ باقاعدگی سے ان کا علاج کروا رہے ہیں۔ کیا افاقہ نہیں ہو رہا ہے؟"

"اچانک تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اسپتال لے گئے تو ڈاکٹرز نے بتایا کہ دوائیں تبدیل

کرنی ہوں گی۔ زندگی کی پریشانیوں میں ایک اور پریشانی کا اضافہ ہو گیا۔ دواؤں اور اسپتال کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ قرض کی نوبت آچکی ہے۔"

"آپ کے حالات جان کر ہمیں رنج ہو رہا ہے۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔ ہم آپ کے کسی کام آنا چاہتے ہیں۔"

"ولید کو ایڈمٹ ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اب اسے ڈسچارج کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسے گھر لاسکتے ہیں' لیکن اس سے پہلے اسپتال کا بل ادا کرنا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا چھ ہزار کا بل کہاں سے ادا کروں۔ رشتے داروں اور عزیزو اقارب کے دروازے سے مایوس ہو کر لوٹ آیا ہوں۔"

"تیرگی میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی یہ پریشانی دور ہو جائے گی۔"

ہمنوا کچھ کہنا چاہتے تھے مگر خاموش ہو گئے۔ نواب صاحب نے خادم کو بلا کر کہا۔

"بیگم صاحبہ سے کہو ہم نے دس ہزار طلب کئے ہیں۔"

خادم حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ ہمنوا انہیں احسان مندی سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "آپ نے تو مجھے خرید لیا ہے۔ میں جلد سے جلد آپ کی یہ رقم ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ ہماری فکر نہ کریں۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔"

"میں بھی آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔ آپ ابھی اپنی پریشانیوں کی بات کر رہے تھے۔"

"وہ سوچ میں پڑ گئے کہ غزل کی بات کیسے چھیڑیں۔ انہیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا یعنی کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک نامناسب بات مناسب لفظوں میں کہنا چاہتے ہوں اور انہیں الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

ہمنوا نے پوچھا۔ "کیا ایسی کوئی بات ہے جسے ہم سے کہتے ہوئے ہچکچا رہے ہیں؟"

"نہیں.......... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ اپنی ایک شاگرد کو تین ماہ قبل یہاں مشاعرے میں لائے تھے۔ کیا خوب غزل سنائی تھی۔ نام بھی غزل تھا۔"

"جی ہاں.......... اچھی ذہین لڑکی ہے۔ غزل گوئی میں نمایاں مقام حاصل کرسکتی

ہیں۔ ایک ماہ پہلے ان کے والد سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بیچارے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ بیمار بھی رہتے ہیں۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ کہہ رہے تھے کہ غزل نے بیٹا بن کر ساری ذمے داریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔"

سعد اللہ نے متاثر ہو کر کہا۔ "بڑے حوصلے والی ہے۔ ہم نے انہیں ملازمت کی آفر دی تھی۔ ہم معقول تنخواہ بھی دے سکتے ہیں لیکن وہ پلٹ کر نہیں آئیں۔"

"شاید وہ فیکٹری اور آفس کے ماحول سے گھبراتی ہیں؟"

"مگر آپ تو ہماری فیکٹری کے ماحول سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم نے ان پر بھی یہ بات واضح کردی تھی کہ وہاں مرد اور خواتین کے کام کرنے کا علیحدہ انتظام ہے پھر جانے کیوں انہوں نے پریشانیوں کے باوجود ہم سے رابطہ نہیں کیا؟"

"شاید ان کی کوئی مجبوری ہو؟"

"ہم نے انہیں اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا تھا۔ فون کے ذریعے رابطہ کرسکتی تھیں۔"

وہ ذرا توقف سے بولے۔ "کیا آپ کسی طرح ان سے ملاقات کرسکتے ہیں؟ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے حالات معلوم ہوں۔ شاید ہم اور آپ ان کے کسی کام آسکیں؟"

ہمنوا نے محسوس کیا کہ وہ غزل میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کی باتوں سے ان کے اندر کی بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

ہمنوا نے کہا۔ "کل اسپتال کے معاملات سے فارغ ہو جاؤں گا۔ بیگم اور ولید کو گھر پہنچا کر فرصت ہوگی تو غزل کی طرف جاؤں گا۔"

خادم اجازت لے کر کمرے میں آیا پھر ایک لفافہ نواب صاحب کو دے کر چلا گیا۔

انہوں نے وہ لفافہ ہمنوا کو دیتے ہوئے کہا۔ "آپ رقم کی واپسی کی فکر نہ کریں۔ مزید ضرورت ہو تو اپنا سمجھ کر چلے آئیں۔ آپ چاہیں تو ہم ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کرسکتے ہیں۔"

وہ لفافہ لیتے ہوئے بولے۔ "میں آپ کی گفتگو کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کو اپنا سمجھوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ بھی مجھے اپنا سمجھ کر دل کی بات زبان پر لے آئیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا ہمراز پائیں گے۔"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آخر کو شاعر ہیں۔ حرفِ مدعا سنتے ہی معاملے کی گہرائی

تک پہنچ جاتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم آج تک اولاد سے محروم رہے۔ یہ آپ جانتے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ آپ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ مقدر کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔"

"لیکن اب تقدیر بدل رہی ہے۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق ہم باپ بن سکتے ہیں۔"

ہمنوا نے خوش ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ تو معجزہ ہو رہا ہے۔ خدا آپ پر مہربان ہے۔ انشاء اللہ اب آپ صاحبِ اولاد کہلانے لگیں گے۔"

"لیکن آپ یہ بھی تو جانتے ہیں کہ بیگم معذور ہیں۔ ازدواجی وظیفہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ دوسری شادی لازمی ہوگئی ہے۔"

"بے شک! آپ دوسری شادی کرسکتے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ کی صحت بھی خوب ہے۔"

خوشی کے مارے ان کا سینہ تن گیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہمنوا صاحب! آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ ایمان سے کہئے گا کیا ہم بوڑھے دکھائی دیتے ہیں۔"

انہوں نے ابھی ابھی ہمنوا کو دس ہزار روپے دیئے تھے۔ دس ہزار کی عینک لگانے کے بعد بھی وہ بوڑھے دکھائی دیتے تو ان سے عینک چھین لی جاتی۔

انہوں نے کہا۔ "آپ بوڑھے! یہ خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟ میری نظریں اتنی کمزور تو نہیں ہیں کہ آپ بوڑھے نظر آنے لگیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی اندھا بھی آپ کو چھو کر بے ساختہ جوان کہے گا۔"

وہ سنجیدہ رہنے کے عادی تھے لیکن ایسی تعریف سن کر بے اختیار مسکرانے لگے پھر بولے۔ "آپ کی باتوں سے ہمیں حوصلہ ہو رہا ہے۔ اب آپ ہی ہماری شادی کے لئے کچھ کرسکتے ہیں۔ بخدا جب سے غزل کو دیکھا ہے' تب سے عجیب حالت ہے۔ ہم سوچنا نہیں چاہتے مگر وہ پھر بھی خیالوں میں چلی آتی ہے۔ آپ ماشاء اللہ مانے ہوئے شاعر ہیں۔ ہماری دلی کیفیات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"

"جی ہاں! میں خوب سمجھ رہا ہوں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں رشتے کی بات چلاؤں؟"

"لیکن ہم چاہتے ہیں پہلے ہم غزل کے مزاج اور رجحان کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اللہ جانتا ہے ہمارے ارادے نیک ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ان کا تمام بوجھ ہم اٹھالیں۔ انہیں اپنے گھر کی ساری ذمے داریوں سے سبکدوش کردیں۔"

"یہ تو سراسر نیکی ہے جناب! آپ انہیں عزت و آبرو سے بیاہ کرلائیں گے پھر ان کے گھر کی تمام ذمے داریاں بھی اٹھائیں گے۔ ان کے بوڑھے والدین کا سہارا بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے۔ میں کل ہی غزل سے ملاقات کروں گا۔"

"کیا آپ کل شام تک ان کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟ ہم اپنے ڈرائیور کو حکم دیتے ہیں۔ وہ کل صبح آپ کو اسپتال لے جائے گا۔ آپ کے بیوی بچوں کو گھر پہنچائے گا۔ آپ اسی گاڑی میں غزل کے پاس جاسکیں گے پھر آرام سے یہاں آسکیں گے۔"

"یہ تو آپ کی بڑی [illegible]زی ہوگی۔ ایک دن کے لئے آپ کی گاڑی مل جائے تو ہم سارے کام نمٹالیں گے۔"

سعد اللہ جان نے ایک ڈرائیور کو طلب کیا پھر اس سے کہا۔ "یہ ہمنوا صاحب ہیں۔ انہیں ابھی گھر پہنچاؤ پھر کل صبح گاڑی ان کے گھر لے جاؤ۔ کل تمام دن گاڑی ان کے ڈسپوزل میں رہے گی۔"

ڈرائیور نے کہا۔ "جی حضور! میں گاڑی گیراج سے نکال لوں۔"

وہ چلا گیا۔ سعد اللہ جان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تو آپ ماشاء اللہ معاملہ فہم ہیں پھر بھی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ آپ پہلے غزل کے مزاج کو سمجھ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی پہلو سے ہماری سبکی ہوجائے۔"

"سبکی ہو دشمنوں کی۔ جناب! آپ ان کے سر سے پہاڑ اتار رہے ہیں۔ انہیں تو آپ کا احسان مند ہونا چاہئے اور وہ ہوں گے۔ آپ چاہتے ہیں پہلے غزل کے مزاج کو سمجھا جائے۔ آپ اطمینان رکھیں ہم باتوں ہی باتوں میں ان کے مزاج اور ان کے خیالات کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کوٹھی سے باہر آئے۔ ہمنوا ان سے مصافحہ کرکے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

سعد اللہ جان نے کہا۔ "ہم کل پانچ بجے ہی فیکٹری سے واپس آجائیں گے اور یہاں

آپ کے منتظر رہیں گے۔ اچھا............ اللہ حافظ۔"

گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ وہ گاڑی کو اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اگلے وقتوں کے لوگ پیغام رسانی کے لئے کبوتر اڑایا کرتے تھے پھر نظروں سے اوجھل ہونے تک اسے دیکھتے رہتے تھے۔ شاید یہ کبوتروں کے اسی دور کی شاعری ہے۔

واسطہ ای رب دا تو جاویں وے کبوترا
چٹھی میرے ڈھول نو پہنچاویں وے کبوترا

کبوتر ان کی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکا تھا۔ اب کل تک ان کی واپسی کا انتظار تھا۔

☆------☆------☆

غزل نے دروازہ کھولا۔ اس کی امی اپنے دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اندر آئیں اور ہانپتے ہوئے بولیں۔ "ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔"

وہ مٹکے سے ایک گلاس پانی نکال کر لائی۔ انہیں گلاس دیتے ہوئے بولی۔ "ابو کیسے ہیں؟ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ دو گھونٹ پینے کے بعد بولیں۔ "وہی سانس کی تکلیف ہے۔ کل آپریشن ہے۔ گلے میں سانس کا آلہ لگایا جائے گا۔"

وہ پھر پانی پینے لگیں۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے؟"

"تشویش کی بات یہ ہے کہ چار یا پانچ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ جناح اسپتال میں علاج اور آپریشن کے پیسے نہیں لئے جاتے' لیکن باہر دکانوں سے دوائیں خریدنی پڑتی ہیں۔ محلے والوں سے پہلے ہی اتنا قرض لے چکے ہیں کہ اب ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ڈاکٹر نے اچانک ہی آپریشن کی خبر سنادی۔ اتنی جلدی رقم کہاں سے آئے گی۔"

وہ خالی گلاس لے کر بولی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ رقم ہو جائے گی۔ آپ نے ابو کو تسلی دی ہے نا؟"

"تمہارے ابو جہاندیدہ ہیں۔ انہیں طفل تسلیوں سے بہلایا نہیں جاسکتا۔ وہ آپریشن

کے لئے راضی نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے جھوٹ کہہ دیا کمیٹی ڈالی تھی' وہاں سے پانچ ہزار ملنے والے ہیں۔"

"آپ نے اچھا کیا۔ اسپتال جاتے وقت پانچ ہزار لے جائیں۔"

وہ حیرانی سے بولیں۔ "کیا تمہارے پاس پانچ ہزار ہیں۔"

"ہیں' آپ فکر نہ کریں۔"

وہ منہ پھیر کر گلاس رکھنے چلی گئی۔ اماں نے بے اختیار متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر پوچھا۔ "سکندر کہاں ہے؟"

وہ کچن سے بولی۔ "وہ تو ہوا کی طرح آتے ہیں اور ہوا کی طرح گزر جاتے ہیں۔ پتا نہیں' کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے؟"

"یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟"

وہ اسی سمت دیکھنے لگیں جبکہ کچن نظر آرہا تھا' نہ بیٹی۔ صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا' وہ ماں سے منہ چھپا رہی ہے۔

اس کی ہچکچاتی آواز سنائی دی۔ "سکندر نے دیئے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ اتنی بڑی رقم سکندر نے کیوں دی ہے؟ یہ رقم وہ ماں کو دے سکتا تھا۔ بیٹی کو کیوں دی ہے؟

انہوں نے پوچھا۔ "کیا وہ کل رات کو بھی یہاں تھا؟"

فوراً جواب نہیں ملا۔ خاموشی جھجک رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔ "امی! ابھی کہہ چکی ہوں' نہ ان کے آنے کا کوئی وقت ہے' نہ جانے کا۔ میں سالن گرم کر رہی ہوں' آپ منہ ہاتھ دھولیں۔"

وہ پچھلی رات والی بات کو ٹال رہی تھی۔ ماں ٹال مٹول کو سمجھ رہی تھی۔ اس دیوار کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے کچن تھا۔ وہ دیوار ماں بیٹی کے درمیان پردہ بن گئی تھی۔ یہ اچھا ہی تھا۔ وہ دونوں ایسے وقت نظریں ملا کر باتیں نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگیں۔ انہیں اندھیرا ہونے سے پہلے پھر اسپتال جانا تھا۔ مجبوری تھی' جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ کیا وہ راتوں کو آیا کرتا ہے؟

یہ سوال چبھ رہا تھا۔ اپنی اوقات سے زیادہ بڑی رقم ملے تو وہ اسی طرح چبھتی ہے۔ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بیٹی نے روٹیاں لاکر رکھیں تو ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کھاتے کھاتے سوچنے لگیں۔

”سکندر سے بات کرنی ہوگی۔ شادی جتنی جلدی ہوجائے‘ اتنا ہی اچھا ہے۔ جوان لڑکا یہاں آتا ہے۔ محلے والے باتیں بنائیں گے اور وہ باتیں غلط نہیں ہوں گی۔“

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولیں۔ ”غزل! ہمارے پاس ایک ہی دولت رہ گئی ہے اور وہ ہے عزت............“

غزل کا سر جھک گیا۔ وہ بولیں۔ ”تمہارے ابو سکندر سے تمہارے رشتے کی بات کرنا چاہتے ہیں‘ لیکن اس سے پہلے اس کا یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ رائی کا پربت بنادیتے ہیں۔ محلے والے اسے یہاں دیکھتے ہوں گے۔“

”دیکھتے ہیں تو دیکھنے دیں۔ سامنے والی انیلا کو فیکٹری کا مالک کار میں یہاں پہنچانے آتا ہے۔ دوسری گلی میں خالدہ کے گھر جاکر دیکھیں۔ چھ مہینوں میں نیا فرنیچر‘ رنگین ٹی وی آگیا۔ فرش پر قالین بچھ گیا۔ آپ محلے والوں کی باتیں نہ کریں۔ کیا یہاں کسی کے گھر سے ابو کے آپریشن کے لئے پانچ ہزار مل سکتے ہیں؟ پانچ روپے بھی نہیں ملیں گے۔“

وہ چپ رہیں۔ کھانا چھوڑ دیا۔ لقمہ حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟“

”کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ روٹیاں باندھ دو۔ بھوک لگے گی تو اسپتال میں کھالوں گی۔“

وہ کھانے کی پلیٹیں اٹھاکر لے گئی۔ ماں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تم کسی نواب صاحب کا ذکر کررہی تھیں۔ ان کی فیکٹری میں ملازمت ملنے والی تھی۔“

”میں ملازمت نہیں کروں گی۔“

”نہیں کروگی؟ یہ پہاڑ جیسے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟“

”انہوں نے منع کیا ہے؟ وہ نہیں چاہتے کہ میں کہیں نوکری کروں۔“

”کس نے منع کیا ہے؟ کون نہیں چاہتا کہ تُو نوکری کرے؟“ غزل نے کسی کا نام نہیں لیا پھر بھی ماں نے سمجھ لیا تھا۔ کچھ باتوں کے لئے وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔ ایک

کنکر پھینکتے ہی پورے تالاب میں ہلچل پیدا ہوجاتی ہے۔ دور تک لہریں بنتی جاتی ہیں۔ دور تک بات سمجھ میں آتی جاتی ہے۔

اب وہ بیٹی سے کیا پوچھیں کہ وہ کس رشتے سے منع کررہا ہے؟ کیا ساری زندگی ہمارا بوجھ اٹھائے گا؟ اگر کسی وجہ سے رشتہ نہ ہوا۔ شادی نہ ہوئی تو نوکری بھی گئی اور بوجھ اٹھانے والا بھی گیا۔

اب وہ پانچ ہزار ایسے لگ رہے تھے جیسے بھاری پتھر سینے پر رکھ دیا گیا ہو۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ رات کا حاتم طائی بیٹی کو دس ہزار روپے دے گیا ہے۔ مسئلہ حل ہورہا تھا۔ ضرورت پوری ہورہی تھی مگر چور دروازے سے۔

وہ دبے لفظوں میں بولیں۔ ”کوئی ساری زندگی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ شادی کی امید رکھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ تم سمجھ دار ہو مگر میری سمجھ سے بھی کام لو۔ اپنی خود داری اور آنا کو سمجھو۔ اپنے بل پر زندگی گزارو۔ اچھی ملازمت مل رہی ہے تو قبول کرو۔“

اسے ماں کی نصیحت اچھی نہیں لگی۔ وہ سکندر پر بھروسا نہ کرنے کا سبق پڑھا رہی تھی جبکہ وہ رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ وہ خود داری اور آنا کی بات کررہی تھیں۔

اپنے مرد سے ہار جانے کے بعد کہاں کی خود داری اور کہاں کی آنا؟

سکندر نے اسے ملازمت کرنے سے منع کیا تو اسے بہت اچھا لگا۔ اس کے اس حکم کے پیچھے بے پناہ محبت بھی تھی اور غیرت بھی۔ وہ اپنی غزل کو کسی کی نوکری کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی غزل کے معاملے میں غیرت مند تھا۔ وہ تاحیات اپنی غزل کا بوجھ اٹھانا چاہتا تھا۔ ایسا چاہنے والا کسی نصیب والی کو ہی ملتا ہے۔ یہ بات ماں کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں انہوں نے اتنی عمر کیسے گزار دی تھی۔

دنیا کے تمام والدین بوڑھے ہونے کے بعد گھسے پٹے ناتجربہ کار لگتے ہیں۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”وہ آپ سے ابو سے اس سلسلے میں بات کرنے والے ہیں۔“

اس نے وضاحت سے نہیں کہا تھا کہ سکندر کس سلسلے میں بات کرنے والا ہے؟ وضاحت ضروری نہیں تھی۔ بیٹی جو بھی کنکر مارتی تھی وہ ٹھیک نشانے پر ماں کو لگتا تھا۔

وہ بولیں۔ ”اس کا کوئی مستقل روزگار نہیں ہے۔ کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ پتا

نہیں کیا کرتا پھرتا ہے؟ رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے اور کہتا ہے کہ کاروبار کر رہا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تمہارا رشتہ ہو جائے مگر دودھ پینے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ مکھی پڑی ہے یا نہیں۔ کچھ مکھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دودھ پینے کے بعد تہہ میں نظر آتی ہیں۔

غزل زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ "امی تو بس یونہی کچھ سوچے سمجھے بغیر بولتی چلی جاتی ہیں۔ کہنے کو کوئی بات نہ ملی تو سکندر کو مکھی بنا دیا۔"

وہ بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ وہ بیڈ اسے کروٹ کروٹ اس کی یاد دلاتا تھا اور وہ اسے یاد کرنے کے لئے ہی اس کی آغوش میں آکر کروٹیں بدلتی رہتی تھی پھر اس کو سوچتے سوچتے سو جاتی تھی۔

پھر اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔ دنیا والوں سے آنکھ چراتے ہی وہ بند آنکھوں کے پیچھے آگیا۔ اس سے ہنسنے بولنے لگا۔ اسے چھیڑنے لگا۔ چھیڑنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ وہ ایسے انداز میں چھیڑنے لگا کہ ماں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ "غزل اٹھو' مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بولیں۔ "سالن اور روٹی باندھ دو۔ تمہارے ابو انتظار کر رہے ہوں گے۔"

وہ واش روم میں جاکر منہ ہاتھ دھونے کے بعد آئی۔ پھر چولہا جلا کر سالن چڑھا کر کمرے میں آگئی۔ الماری کھول کر کپڑوں کی تہہ میں چھپے ہوئے دس ہزار میں سے پانچ ہزار روپے نکالے۔ اس کی امی کچن میں آگئی تھیں۔ سالن کی ہانڈی میں چمچ چلا رہی تھیں۔ اس نے رقم دیتے ہوئے کہا۔ "آپ ہٹ جائیں۔ میں سالن دیکھ رہی ہوں۔ یہ روٹیاں تو رات تک سوکھ کر سخت ہو جاتی ہوں گی۔ آپ کیسے کھا لیتی ہیں؟"

"شوربے میں بھگو لیتی ہوں۔ شوربا نہ ہو تو پانی میں بھگو کر نرم کر لیتی ہوں۔ کسی طرح گزارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ غزل کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ آگیا۔ کیا چھلیا ہے؟ پھر چھل کرے گا اور چلا جائے گا پھر آئے گا پھر چھل کرے گا اور چلا جائے گا۔ باز ہے' پلٹ کر آنے اور جھپٹ کر جانے سے باز نہیں آتا۔

ماں نے دروازہ کھولا۔ وہ ماں کے پیچھے آئی۔ باہر گلی میں جیپ کھڑی تھی۔ سکندر

نہیں تھا۔ اس کے ساتھی تھے۔ ایک سپاہی تھا۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "سکندر یہاں رہتا ہے؟"

ماں نے کہا۔ "یہاں رہتا تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی ملنے آجاتا ہے۔ ہمارے دور کا رشتے دار ہے۔ تم اسے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ ہم سے چھپ رہا ہے۔ اگر اس نے گرفتاری پیش نہ کی تو کب تک چھپتا رہے گا۔ سالے کو جوتے بھی پڑیں گے اور لمبی سزا بھی ہوگی۔"

ماں بیٹی نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ماں نے کہا۔ "دیکھو بھیا! وہ ہمارا کوئی سگا نہیں ہے۔ اندر آکر دیکھ لو۔ ہم نے اسے چھپایا نہیں ہے۔ خدا کے لئے یہاں نہ آیا کرو۔ پولیس کو دروازے پر دیکھ کر محلے والے باتیں بناتے ہیں۔"

غزل نے پوچھا۔ "اس نے کیا کیا ہے؟ اس کی غلطی معاف نہیں ہو سکتی۔"

سپاہی کے ساتھ سکندر کا ایک ساتھی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "گولیمار میں بم دھماکا ہوا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں مطلوب ہے۔"

پھر وہ سپاہی سے بولا۔ "آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں بات کرتا ہوں۔"

سپاہی جیپ کی طرف چلا گیا۔ سکندر کے ساتھی نے کہا۔ "معاملہ بہت سنگین ہے۔ اگر وہ پکڑا گیا تو پھر لمبا ہی جائے گا۔ کوئی اس کا مقدمہ لڑنے والا بھی نہیں ہے۔ اس کے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے۔ تھانے والوں کو کچھ کھلا پلا کر اس کیس سے سکندر کا نام مٹا دیا جائے۔"

ماں نے کہا۔ "ہم کہاں سے رشوت دیں گے۔ اس کے ابو اسپتال میں ہیں۔ کل صبح ان کے گلے کا آپریشن ہے۔ ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہیں۔"

غزل نے کہا۔ "امی! آپ چپ رہیں۔ ہاں بھائی! آپ بولیں۔ یہ کیا چاہتے ہیں۔ آپ تو ہماری حالت دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"پولیس والے کسی کے حالات نہیں دیکھتے۔ اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ وہ دس ہزار مانگ رہے ہیں۔"

"دس ہزار؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ ہماری اوقات سے زیادہ ہے۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ دو چار ہزار میں بات بن سکتی ہے تو ہم کل تک کہیں

سے انتظام کریں گے۔"

ماں نے کہا۔ "کہاں سے انتظام کرو گی؟ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ خدا کی پناہ! آج پتا چلا کہ وہ دہشت گرد ہے۔ میں تو اسے دروازے پر قدم رکھنے نہیں دوں گی۔ جاؤ بھیا! اس کے ساتھ جو سلوک کرتے ہو کرو۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"امی! خدا کے لئے خاموش رہیں۔ اندر جائیں۔ مجھے بات کرنے دیں۔"

سکندر کے ساتھی نے کہا۔ "میں آپ سے صاف کہہ دوں' وہ دو چار ہزار میں نہیں مانیں گے۔ پولیس مقابلے کا نام دے کر اسے گولی مار دیں گے۔"

غزل کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ بولا۔ "میں ان سے معاملات طے کروں گا۔ انہیں آٹھ ہزار میں راضی کروں گا۔ وہ اس سے کم میں نہیں مانیں گے۔ جتنی زیادہ رقم کا انتظام ہو جائے اچھا ہے' ورنہ وہ بے موت مارا جائے گا۔ ہم کل صبح آئیں گے۔"

وہ واپس جا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ وہ جیپ اسٹارٹ ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ غزل پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ چشم تصور سے سکندر کو گولی کھا کر گرتے اور دم توڑتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ماں کے سامنے ضبط نہ کر سکی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی آ کر بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔

اس کے پاس دس ہزار تھے۔ وہ صبح تک رشوت دے کر اسے بم دھماکے کے الزام سے بری کرا سکتی تھی۔ اگر ایسا نہیں کرے گی تو پولیس والے مال نہ ملنے پر درندے بن جاتے ہیں۔ وہ ایسے مجرموں کو گرفتار نہیں کرتے۔ کاؤنٹر فائرنگ میں ہلاک کر دیتے ہیں۔

دس ہزار نہ سہی آٹھ ہزار' لیکن اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟

وہ پانچ ہزار ماں کو دے چکی تھی۔

باپ کا آپریشن ضروری تھا۔ گلے میں ایک آلہ لگا کر زندگی کی سانسوں کو جاری رکھنا تھا اور ایک فریب کرنے والے عاشق کی سلامتی بھی ضروری تھی۔ وہ جیسا بھی تھا' جی جان کا مالک تھا۔

وہ اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ ایک فائر کی آواز کے ساتھ اپنے پیارے کی چیخ سنائی دے رہی تھی اور شفقت سے سر پر ہاتھ رکھنے والے کی سانسیں بھی پکار رہی تھیں۔

نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن۔

☆------☆------☆

ماں نے کمرے میں آ کر اسے دیکھا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ یہ سراسر بے حیائی تھی۔ اپنے نامحرم کے لئے رو رہی تھی۔ کیا رشتہ ہے اس سے؟ کیا وہ آنکھوں مین آنسو دینے والے رشتے کی مہر لگا چکا ہے؟

وہ آنسو یقین دلا رہے تھے کہ بیٹی بہت بڑی غلطی کر چکی ہے۔ وہ قریب آ کر بولیں۔ "یہ تم کس کے لئے رو رہی ہو؟ وہ کون ہوتا ہے تمہارا؟"

وہ کیا جواب دیتی۔ اسے یہ بات رُلا رہی تھی کہ جسے اپنا شریکِ زندگی بنانا چاہتی ہے' وہ اس کے مزاج اور اس کے معیار کے برعکس ہے۔ وہ اس کے ساتھ ایک سیدھی سادی اور صاف ستھری زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ دولت کماتا اور ایک ہی دن میں دس ہزار لا کر دیتا۔ ایسی دولت کے پیچھے پولیس والوں کی گالیاں اور بعد میں گولیاں ہوتی ہیں' ذلت ہوتی ہے' شرمندگی ہوتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ دولت نہ کماتا' عزت کماتا۔ وہ اسی بات پر رو رہی تھی کہ عزت نہ کمانے والے کو اپنی عزت دے چکی ہے۔

وہ آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی پھر ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "پہلی بار آپ نے ابو نے سکندر کو یہاں رہنے کے لئے کہا تھا۔ آپ نے اسے سگے رشتے داروں سے زیادہ محبتیں دیں۔ سکندر نے بھی محبت اور اپنائیت میں کمی نہیں کی۔ ایک بار انہوں نے ایک ہزار روپے آپ کو دیئے اور یہ جو پانچ ہزار آپ لے کر جا رہی ہیں یہ بھی انہی کی دی ہوئی رقم ہے۔ آپ نے یہ رقم تو رکھ لی ہے مگر بے مروتی سے پوچھ رہی ہیں کہ وہ کون ہوتا ہے ہمارا؟"

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی نے کہا۔ "وہ ہمارے برے وقت میں کام آ رہے ہیں کیا ہمیں ان کی مصیبت میں کام نہیں آنا چاہئے؟"

وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "تم........... کیا پانچ ہزار پولیس والوں کو دے کر سکندر کو ان سے نجات دلانا چاہتی ہو؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کل ابو کا آپریشن ہے۔ دواؤں کے لئے پتا نہیں

کتنی رقم کی ضرورت ہو گی۔ اگر ہم پولیس والوں کو آٹھ ہزار دے کر انہیں نجات نہیں دلائیں گے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ یہ رقم انہی کی ہے۔ ان کے کام نہیں آئے گی تو ہم امانت میں خیانت کرنے والے لوگ کہلائیں گے۔"

اس کی امی سر جھکا کر بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئیں۔ نیم مردہ سی آواز میں بولیں۔ "رقم نہ رہی تو کل کیا ہو گا؟ میں خدا سے ڈرتی ہوں۔ سکندر کی رقم ہے۔ اس کے کام آنی چاہئے مگر......... " وہ آگے نہ بول سکیں۔ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگیں۔ غزل نے بے بسی سے اور محبت سے انہیں دیکھا۔ ان کے قریب ہو کر بیٹھ گئی پھر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "آپ پریشاں نہ ہوں۔ انہوں نے پانچ نہیں دس ہزار دیئے تھے۔"

ماں نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ پتا نہیں کتنی مدت گزر چکی تھی۔ انہوں نے دس ہزار روپے یک مشت نہیں دیکھے تھے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس سے گھر کی عزت اور غیرت کو خریدا جا سکتا تھا۔ اس صدمے سے پھر آنسو آگئے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے اور بیٹی کا مول تول نہ کرتے ہوئے بھی ایسے شرمندہ کرنے والے مرحلے سے گزر چکی ہیں۔

بیٹی نے کہا۔ "آپ مجھے دو ہزار دیں۔ تین ہزار دواؤں کے لئے لے جائیں۔ یوں میرے پاس سات ہزار رہیں گے۔ میں سکندر کے دوستوں سے کہوں گی کہ وہ پولیس کو کسی طرح سات ہزار میں راضی کر کے ان سے سکندر کی جان چھڑائیں۔"

انہوں نے دو ہزار غزل کو دیئے۔ تین ہزار اپنے پاس رکھتے ہوئے بولیں "مجھے یہ تین ہزار لیتے ہوئے شرم آرہی ہے مگر کیا کروں؟ شرم اور غیرت کو دیکھوں گی تو تمہارے ابو کا کیا بنے گا؟ تم نے......... تم نے مجھے شرمناک موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ غزل سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اگر سکندر اس کے گھر اور اس کی زندگی میں نہ آتا تو کیا زندگی نہ گزرتی؟ باپ کا آپریشن نہ ہوتا؟ ہوتا یہ ہے کہ زندگی کسی طور گزر ہی جاتی ہے۔ نہ گزرے تو موت کی سمت چلی جاتی ہے۔ بیمار کا پورا علاج نہ ہو تو آدھا علاج ہو جاتا ہے۔ نصف علاج سے کسی کسی کو شفا ملتی ہے۔ باقی کو نہیں ملتی۔ اس لئے کوئی نصف علاج اور اللہ توکل کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ پورے علاج کے لئے اور پوری زندگی گزارنے کے لئے مجبوریاں چور دروازے کھول دیتی ہیں۔

ماں کی آواز سنائی دی۔ "میں جا رہی ہوں۔ دروازہ بند کر لو۔"

پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ جا چکی تھی۔ غزل وہیں بیڈ پر بیٹھی رہی۔ سکندر اس کے اندر گردش کر رہا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے دل سے سوچ رہی تھی۔ انہوں نے دل توڑا ہے۔ میرے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔ مجھے آئندہ ان پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ فی الحال میں اپنا فرض پورا کروں گی۔ انہیں پولیس سے نجات دلاؤں گی پھر ان سے صاف کہہ دوں گی کہ ہمارے رستے الگ ہیں' وہ یہاں نہ آیا کریں۔

وہ بیڈ سے اتر کر الماری کے پاس آئی۔ اسے کھول کر کپڑوں کی تہہ سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکالے۔ ان میں دو ہزار ملائے پھر انہیں پہلے کی طرح کپڑوں کی تہہ میں چھپا دیا۔ کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی۔

"انہوں نے مجھے ملازمت کرنے سے منع کیا تھا کیا میں اب بھی نہ کروں؟"

اب حالات بدل رہے تھے۔ اپنی گھر کی ذمے داریوں کا بوجھ خود اٹھانا تھا۔ جسے سرتاج بنانا چاہتی تھی' وہ سر کا تاج زمین پر گر رہا تھا۔ گرنے والے کے ساتھ اسے نہیں گرنا تھا۔ اسے سنبھالنا تھا۔ اگر وہ نہ سنبھلنا چاہتا تو راستہ الگ کرنا تھا اور راستہ وہی اچھا ہوتا ہے جس پر چل کر عزت اور نیک نامی ملتی ہے۔

اس نے الماری بند کی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے لئے سامنے والے کمرے میں آئی۔ دور مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مغرب کی اذان ہے۔ وال کلاک پر نظر پڑی تو پتا چلا کہ بہت وقت گزر چکا ہے۔ عشا کی اذان ہو رہی ہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ "کیا وہ آیا ہے؟"

نہیں وہ نہیں تھا۔ پڑوسن کی آواز سنائی دی۔ "غزل! دروازہ کھولو۔"

وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو سلیقے سے رکھتے ہوئے بولی۔ "دروازہ کھلا ہے اندر آجائیں۔"

باہر سے آواز آئی۔ "اے بیٹی! تم نے اندر سے بند کر رکھا ہے؟"

غزل نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اوپر والی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ وہ اندر سے بند تھا۔ وہ حیرت کے لمحات تھے۔ اس کی امی باہر جا کر اسے اندر سے نہیں بند کر سکتی تھیں۔ وہ بند کرنے وہاں آئی تھی لیکن وہ پہلے سے بند تھا۔ کیسے؟ پھر دستک ہوئی۔ پڑوسن

نے پوچھا۔ "کیا کسی کام میں الجھی ہوئی ہو؟ کوئی بات نہیں میں پھر آ جاؤں گی۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "رک جائیں خالہ! میں آ رہی ہوں۔"
اس نے دروازہ کھول دیا۔

پڑوسن خالہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کر رہی تھیں؟ اکیلی ہو گئی ہو۔ دل گھبراتا ہو گا؟ تمہارے ابو ہسپتال سے کب آئیں گے؟"

"پتا نہیں خالہ! کل ان کا آپریشن ہے۔ دعا کریں' آپریشن کامیاب ہو اور وہ اچھے ہو جائیں۔"

"اللہ بڑا بادشاہ ہے۔ وہ سب کی خیر کرتا ہے۔ میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں' تمہارے ابو کے لئے دعا کروں گی اور بتاؤ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"نہیں خالہ! کوئی پریشانی ہو گی تو آپ کے پاس آؤں گی۔"

"میں یہی کہنے آئی تھی۔ پڑوسیوں کا فرض ہوتا ہے۔ مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا۔ بیٹی! تمہارے پاس دو سو روپے ہوں گے؟ کل تمہارے خالو کو نیا کام ملنے والا ہے۔ تنخواہ ملتے ہی دو سو روپے لوٹا دوں گی۔"

"آپ نے پچھلے مہینے بیس روپے لئے تھے۔ وہ اب تک واپس نہیں کئے۔ آپ ہمارے حالات جانتی ہیں ابو اسپتال میں ہیں اور........."

وہ اس کی بات کاٹ کر بولیں۔ "میں سب جانتی ہوں بیٹی! میں دو سو کے ساتھ تمہارے بیس روپے بھی لوٹا دوں گی۔ دیکھو منع نہ کرنا۔"

غزل کی نظریں دروازے پر گئیں۔ اسے پھر یاد آیا کہ وہ اندر سے بند تھا۔ وہ پڑوسن خالہ کی موجودگی میں نہ سوچ سکتی تھی' نہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اندر سے کیسے بند ہو گیا؟ اس نے کہا۔ "آپ یہاں بیٹھیں میں ابھی پیسے لاتی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں آئی۔ الماری کھول کر دو سو روپے نکالے پھر سامنے والے کمرے میں آ کر پڑوسن کو دیتے ہوئے بولی۔ "میں جانتی ہوں' خالو کو کہیں کام نہیں مل رہا ہے۔ ہمارے گھر میں بھی کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ مجھے امید ہے' آپ یہ قرض جلدی ادا کر دیں گی۔"

وہ رقم لے کر بولیں۔ "فکر نہ کرو......... میں نماز پڑھ کر تمہارے ابو کے لئے دعا

کروں گی۔ خدا بہتری کرے گا۔"

وہ دروازہ کھول کر چلی گئیں۔ غزل اسے بند کر کے چٹخنی کو چھو کر سوچنے لگی۔

"یہ چٹخنی کس نے چڑھائی تھی؟ کیا امی کے جانے کے بعد کوئی آیا ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ گھر کے اندر دور تک خاموشی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دبے قدموں چلتی ہوئی اس کمرے سے نکل کر صحن میں آئی۔ صحن کے دوسری طرف ایک کمرا تھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں کوئی بستر پر پڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

غزل کا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے صحن پار کرتے ہوئے کمرے میں آئی۔ تب اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے چاروں شانے چت پڑا' بہت ہی دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔

وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا' وہ اسے یہاں آنے سے منع کر دے گی۔ اس دیکھتے ہی اپنا فیصلہ بھول گئی۔ اس نے قریب آ کر آواز دی۔ "سکندر!"

وہ آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس کی آواز کانوں تک نہیں پہنچی تھی یا پھر وہ سو رہا تھا۔ وہ ذرا قریب ہو کر بولی۔ "آپ......... آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اس کے حلق سے ایک دھیمی سی آواز نکلی۔ اس نے کچھ کہا۔ پتا نہیں کیا کہا' وہ بولی۔ "فوراً اٹھیں' یہاں سے جائیں۔ پولیس آپ کو پکڑنے یہاں آئی تھی۔ وہ پھر کسی وقت آ سکتی ہے۔"

وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ آنکھیں بھی نہیں کھول رہا تھا۔ اس نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو پتہ چلا کہ وہ شدید بخار میں پھنک رہا ہے۔ وہ تڑپ کر بستر پر آ گئی۔ اس کی پیشانی اور گردن کو چھو کر کہنے لگی۔
"آپ کو تو تیز بخار ہے۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟"

وہ دوڑ کر دوسرے کمرے میں فریج کے پاس آئی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ برف نہیں تھی۔ اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ ایک بڑا سا رومال اور کٹورا لیا پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھتے ہوئے زیر لب کہنے لگی۔ "خدا

جانے آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟ نہ گھر ہے نہ کوئی ٹھکانہ۔ پولیس والوں سے چھپتے پھر رہے ہیں۔ یہ آپ کیسی زندگی گزار رہے ہیں؟"

وہ کپڑے کی پٹی کو ٹھنڈے پانی سے بھگو رہی تھی اور اس کی پیشانی پر رکھ رہی تھی۔ وہ بخار کی شدت کے باعث خود سے غافل ہو گیا تھا۔ غزل کے اس طریقۂ کار کی وجہ سے حرارت کم ہو رہی تھی۔ ایسے وقت وہ سنے یا نہ سنے' یہ سنائے جا رہی تھی۔

"آپ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ میرے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ پولیس والا آپ کو گالیاں دے رہا تھا۔ کیا آپ گالیاں کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟ کیا آپ اس طرح میری زندگی کو ایک گالی نہیں بنا رہے ہیں؟"

وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ دیوار سے لپٹ کر رونے والی بات تھی۔ دیوار کو آنسوؤں سے بھگو دو۔ وہ پھر بھی نہیں سنتی۔

بخار کی شدت کم ہو گئی تھی۔ وہ بخار پھر تیز ہو سکتا تھا لہٰذا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا لیکن وہ تو خود سے غافل تھا۔ بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر کو یہاں بلانا ضروری تھا۔ بڑی مشکل تھی۔ ڈاکٹر آتا تو محلے کی عورتیں پوچھتیں۔ "ڈاکٹر کیوں آیا ہے.......... کون بیمار ہے؟"

وہ پولیس والوں اور محلے والوں سے چھپ کر اندر آیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایک جوان لڑکی ایک جوان لڑکے کے ساتھ گھر میں اکیلی ہے۔ ایک بیمار بھی جوان لڑکی کی تنہائی میں چھپ کر آئے تو بدنامی کو پر لگ جاتے ہیں۔

وہ ڈاکٹر کو بلا نہیں سکتی تھی مگر مریض کا حال بتا کر دوا لا سکتی تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ "یہی کرنا ہو گا۔"

اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "سکندر! میں ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔"

وہ کسمساتے ہوئے' کراہنے لگا پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ سامنے جانِ حیات اس پر جھکی ہوئی تھی۔

وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟ یہ.......... یہ آپ کیسی زندگی گزار رہے ہیں؟"

وہ بڑی کمزوری سے' بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو کو پکڑا۔ اسے بڑی کمزوری سے اپنی طرف کھینچا۔ ایک چاہنے والی کو کچے دھاگے سے کھینچو تو چلی آتی ہے۔ وہ بھی آ گئی۔ اس کے سینے سے لگ گئی۔ سانسوں میں سما گئی۔ ایسے وقت پھر رونا آ گیا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ "آپ نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ آپ کو ایسی زندگی گزارنی تھی تو مجھے برباد نہ کرتے۔ مجھے آبرو سے رہنے دیتے۔ امی آپ سے بہت ناراض ہیں۔ ابو کو معلوم ہو گا تو وہ بھی آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ آپ کو گھر میں نہیں آنے دیں گے۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میں تو کہیں کی بھی نہیں رہی۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ اسے جواباً کچھ کہنا چاہئے تھا۔ مگر وہ چپ تھا پھر دھیمے دھیمے سے خراٹے سنائی دیئے۔ غزل نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔ کیسا بے حس تھا۔ وہ دکھڑا سنا رہی تھی اور وہ لوری سمجھ کر سو گیا تھا۔

اس نے بے بسی سے ایک سرد آہ بھری اور وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے بدن پر ایک چادر ڈالی پھر اس کمرے سے باہر آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر الماری سے تین سو روپے نکالے پھر ایک چادر اوڑھ کر گھر سے باہر آ گئی۔ دروازے کو باہر سے بند کیا۔ ڈاکٹر کا کلینک زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر جانا چاہتی تھی۔

ایک پڑوسن نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔ "اس وقت کہاں جا رہی ہو؟"

"ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔ شام سے ہلکا بخار ہے دوا کھا لوں گی تو صبح ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

وہ پڑوسن کے کسی اگلے سوال سے بچنے کے لئے فوراً ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ سکندر نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ بدنامی سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا۔ اس کی امی کی مخالفت ایک مسئلہ بن رہی تھی۔ اس کے لئے گھر کے دروازے بند کئے جانے والے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ذلت اور بدنامی کے رستے پر چل رہا تھا۔ یہ سوال غزل کو پریشان کر رہا تھا کہ وہ ایسے راستے پر کیسے اس کے ساتھ چلے گی؟

وہ جتنی محبتیں دے رہا تھا' اس سے زیادہ عذاب دے رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے مسائل میں اُلجھا رہا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ وہ جتنی مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اسے اتنا ہی

اس پر پیار آ رہا تھا۔ یہ پیار بھی کیا ہوتا ہے؟ یار کو پروردگار بنا دیتا ہے۔

وہ ڈاکٹر سے جھوٹ سچ بول کر اس کے لیے دوا لے آئی۔ گھر پہنچی تو وہ سو رہا تھا۔ اس نے اسے جگا کر دوائیں کھلائیں۔ وہ دوا کھانے کے لئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سے بولا۔

"کیا تم ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟"

"اور کیا کرتی؟ اسے یہاں بلا نہیں سکتی تھی۔ آپ چھپ کر آئے ہیں۔ محلے والوں کو علم ہو گیا کہ میں تنہا آپ کے ساتھ رات گزار رہی ہوں تو شرم سے مر جاؤں گی۔ امی اور ابو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیں کہ یہ کیسی زندگی گزار رہے ہیں؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ پولیس یہاں آئی تھی۔ تم نے بڑی حد تک سمجھ لیا ہو گا کہ میں نیک نامی کی زندگی نہیں گزار رہا ہوں۔"

"کیوں؟ آپ نے نیک نامی کا راستہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"تمہیں کیا بتاؤں؟ میری طرح کتنے ہی لوگ ہیں۔ جنہیں روزگار نہیں ملتا اور جن کی ملازمتیں ہوتی ہیں' ان کی چھنٹائی کی جاتی ہے۔ بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں جو بزدل اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ محتاجی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں اور جو میری طرح بے باک ہوتے ہیں اور خطرات سے کھیلنا جانتے ہیں' وہ اسلحہ اٹھا لیتے ہیں۔ کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے انڈر گراؤنڈ رہنے والے کارکن بن جاتے ہیں اور دہشت گرد کہلانے لگتے ہیں۔"

"جب آپ نے ایسی ذلت آمیز اور پُرخطر زندگی گزارنے کا ارادہ کیا تو اس وقت میری یاد نہیں آئی؟ گن صرف کے آپ کے پاس نہیں ہو گی۔ آپ کے مخالفین کے پاس بھی ہو گی۔ وہ آپ کو گولی مار سکتے ہیں پھر میرا کیا بنے گا؟ آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ ذلت اور رُسوائی کی زندگی گذاروں؟"

وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "میں تمہاری باتوں کا معقول جواب نہیں دے سکوں گا۔ اسے میری دیوانگی سمجھو۔ جب پہلی بار یہاں آیا تو تمہیں دیکھتے ہی دل ہار گیا تھا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ آئندہ تم سے دور رہ سکوں گا۔ اسے میری خود غرضی کہہ لو۔ میں پیار کی دیوانگی میں تمہاری زندگی برباد کر رہا ہوں۔"

غزل کو اس کی صاف گوئی اچھی لگ رہی تھی۔ یہ سن کر اچھا لگ رہا تھا کہ وہ اس کا دیوانہ ہے اور اسے دیوانگی میں ڈبو رہا ہے۔ کوئی محبت سے زہر بھی دے تو اسے پی لیا جاتا ہے۔ کوئی پیار سے مارے تو مرجانے کو جی چاہتا ہے۔

اس نے کہا۔ "میں آپ کو ایسی زندگی گزارنے نہیں دوں گی۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ وہ بولی۔ "آپ نے مجھے دس ہزار روپے دیئے تھے۔ کل ابو کا آپریشن ہے۔ کچھ رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں نے امی کو تین ہزار روپے دیئے ہیں۔"

"تین ہزار سے کیا ہو گا؟ تمہیں زیادہ دینے چاہئیں تھے۔"

"زیادہ کیسے دیتی؟ تھانے والے آپ کا معاملہ دبانے کے لئے دس ہزار مانگ رہے تھے اور اب میرے پاس سات ہزار رہ گئے ہیں۔ کیا اس رقم سے بات نہیں بنے گی۔"

"بات بن چکی ہے۔ ہمارے لیڈر نے تھانے والوں سے مک مکا کر لیا ہے۔ مجھ پر بم دھماکے کا الزام نہیں ہے۔ آئندہ میں پولیس والوں سے چھپ کر نہیں رہوں گا۔"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ نے میری آدھی پریشانیاں ختم کر دیں۔ اب آپ توبہ کریں اور مجھ سے وعدہ کریں کہ آئندہ ایسی زندگی نہیں گزاریں گے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ مجھ پر دہشت گردی کی چھاپ لگ چکی ہے۔ کہیں بھی کوئی بڑی واردات ہو گی' تو مجھے شک کی بنیاد پر گرفتار کیا جائے گا۔ ایسے وقت پارٹی لیڈر ہی اپنی دولت اور اثر و رسوخ سے مجھے نجات دلایا کرے گا۔ تمہاری مرضی کے مطابق دہشت گردی سے باز رہنے کے لئے اس سیاسی پارٹی کو چھوڑنا ہو گا۔ اگر اس پارٹی کو چھوڑ دوں گا تو وقت بہ وقت پولیس والوں کے جھوٹے الزامات سے اور گرفتاری سے کون بچائے گا؟ جو پارٹی لیڈر آج مجھ پر مہربان ہے۔ کل وہی میرا دشمن بن جائے گا۔"

وہ بستر سے اٹھ گئی۔ اس سے دور ہو گئی۔ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔

"غزل! میرے پاس آؤ' مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ زندگی گھر میں گزارو یا میدانِ جنگ میں' ہر جگہ موت آتی ہے۔ میں کسی آفس میں کام کر رہا ہوں یا گن اٹھا کر انڈر گراؤنڈ کارکن ہوں۔ موت کہیں بھی آئے گی۔"

سی آفس میں قلم پکڑیں گے تو عزت ملے گی۔ بندوق اٹھانے والے ذلت کی موت مرتے ہیں اور اپنے چاہنے والوں کو ذلت اور رسوائی دے جاتے ہیں۔"

سکندر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے؟ وہ رک رک کر بولا۔ "وہ.......... وہ جو کہتے ہیں.......... بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ محبت ہمیشہ بدنامی سے گزرتی ہے جو بدنام نہ ہوئی' وہ محبت ہی کیا؟"

"محبت نیک نام ہوتی ہے اسی لئے زمین کے سینے پر صدیوں سے تاج محل جگمگا رہا ہے۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ میں ایک بات کہتا ہوں اور یہ آخری بات ہے۔ تم میری پہلی اور آخری ضرورت ہو۔ کھاتے پیتے' سوتے جاگتے اور ہر لحہ سانس لیتے وقت ضروری ہو۔ میں جب کبھی ناکام ہوتا ہوں' تھک جاتا ہوں' ہار جاتا ہوں تو یہاں آ کر تمہاری آغوش میں چھپ کر ساری دنیا کو بھول جاتا ہوں۔ تمہاری آغوش میں ممتا بھی ہے اور محبوبیت بھی ہے۔"

ایسے پیار بھرے الفاظ سن کر وہ بے حال ہو گئی۔ بڑے جذبوں سے آ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کے بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ "ایسی باتیں نہ کریں۔ میں ہار جاتی ہوں۔ کیا آپ میرے لئے ایک اچھی اور نیک نامی زندگی جیت نہیں سکتے؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی تو پولیس والے دشمن ہیں' مجھے ان سے بچایا جاتا ہے۔ اگر وہ سیاسی پارٹی والے دشمن بن گئے تو پھر میں مٹی کا کیڑا بن کر رہ جاؤں گا۔ کوئی بھی مجھے پیروں تلے روند کر چلا جائے گا۔"

"ہم یہ جگہ یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ کسی دوسرے صوبے میں بہت دور کسی گمنام علاقے میں جا کر رہیں گے۔"

"ہم سب کی ڈور ایک لیڈر کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسلام آباد میں بیٹھ کر اپنی مرضی کے مطابق سیاست اور دہشت کے کھیل کھیلاتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی کٹھ پتلی اِدھر سے اُدھر ہو گی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں ان سے دشمنی مول لوں؟"

"آپ ایسے دہشت پیدا کرنے والے لوگوں میں کیوں پھنس گئے؟ مجھے بتائیں کہ

میں آپ کے ساتھ کیسے زندگی گزاروں؟ امی اور ابو آپ کو قبول نہیں کریں گے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتا' قبول تمہیں کرنا ہے اور تم کرو گی۔"

وہ آغوش میں تھی۔ وہ اسے لئے بستر پر گر گیا۔ وہ اسے قبول کرانے لگا۔ "آنسہ غزل منظور تمہارا نکاح ایک سیون ایم ایم' ایک ٹی ٹی کے بنڈل اور لوہے کی ایک ہتھکڑی سے پڑھا جا رہا ہے۔ تمہیں قبول ہے؟"

وہ سانس لیتے ہوئے پہاڑ تلے دبی ہوئی تھی۔ بے دم ہو رہی تھی' ہانپ رہی تھی۔

"قبول ہے.......... قبول نہیں ہے.......... قبول ہے.......... قبول نہیں ہے۔ ہاں.......... ناں.......... ہاں.......... ناں.......... ناں.......... ہاں.......... ہاں.........."

☆======☆======☆

نواب سعد اللہ جان رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اوپری منزل کے بیڈ روم میں آئے۔ اوپری منزل ان کی رہائش کے لئے مخصوص تھی۔ تمام رشتے داروں کو نچلی منزل کا ایک ایک کمرا رہائش کے لئے دیا گیا تھا۔ اوپر والے حصے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف چند ایک کنیزیں ان کی خدمت کے لے حاضر ہو جایا کرتی تھیں۔ وہیل چیئر پر زندگی گزارنے والی بیگم ماہ لقا کے لئے ممانعت نہیں تھی لیکن وہ اوپر جا نہیں سکتی تھی۔ نواب صاحب کی کچھ بلندیاں ایسی تھیں جنہیں وہ نیچے سے نہیں چھو سکتی تھی۔

وہ کھانے کے بعد ٹیرس پر آ کر ٹہلتے تھے۔ وہاں ایک کنیز ان کی دلجوئی کے لئے ہوا کرتی تھی۔ ان کی خدمت کے لئے جو کنیزیں تھیں' وہ کسی حد تک تعلیم یافتہ تھیں۔ نواب صاحب نے اپنے شاعرانہ ذوق کے مطابق اپنی خدمت کے لئے انہیں منتخب کیا تھا۔ وہ کنیزیں ان کے مزاج کو سمجھتی تھیں۔

شعر و ادب پر گفتگو کے دوران میں جذباتیت کے چٹخارے لیتی تھیں اور وہ بہت خوش ہوتے رہتے تھے۔

اس رات کنیزیں پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھیں۔ بزرگ شاعر ہمنوا سے حوصلہ ملنے کے بعد غزل اور زیادہ حواس پر چھا گئی تھی۔ دل بے تاب کہہ رہا تھا یہ رات پلک جھپکتے ہی گزر جائے۔ کل کا سورج نکل آئے اور ہمنوا صاحب یہ خوش خبری سنانے آ جائیں کہ غزل بھی ان کی چاہت میں رات رات بھر کروٹیں بدلتی ہے' جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ

ہائے نواب صاحب کہہ کر دوسرا پہلو بدلتی ہے۔

خیالات خوش کن ہوں تو تنہائی بھی رنگین ہو جاتی ہے۔ وہ سامنے آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اپنی اداؤں سے بہلاتی ہے۔ یہ اپنی باتوں سے اسے لبھاتے ہیں۔ ایسے وقت کسی تیسرے کی موجودگی گراں گزرتی ہے۔ انہوں نے سوچا' آج کنیزوں کی چھٹی کر دیں۔ غزل سے بہلتے رہیں' مگر بہلنے سے بات نہیں بنتی کیونکہ وہ اس سے بول سکتے تھے لیکن اسے چھو نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا چھونے کے لئے ایک کنیز کو پاس رکھ لیا تھا۔ یوں ایک سے بول رہے تھے دوسری کو تول رہے تھے۔

کنیز نے پوچھا۔ "آج آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ میرے پاس ہیں لیکن کہیں دور پہنچے ہوئے ہیں۔ کوئی پریشانی ہے؟"

"نہیں۔ بھلا ہمیں کیا پریشانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنا دیا ہے کہ ہم دوسروں کی پریشانیاں دور کرتے رہتے ہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟ آپ کا ذہن حاضر نہیں ہے۔ حضور کس کے خیالوں میں گم ہیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے دل کی بات چھپانے کے انداز میں بولے۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بات ہے مگر بتانے کی نہیں۔ ضد کرو گی تو ہم بتا دیں گے۔

وہ بڑے پیار سے ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "حضور! کنیز سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھپک کر بولے۔ "چھپانے کی کوئی بات نہیں ہے' اور وہ ہے بھی تو کیا۔ بس کوئی خاص بتانے والی بات نہیں ہے۔"

"پھر تو ضرور کوئی خاص بات ہے۔ آپ چھپا رہے ہیں۔ آپ کو میری جان کی قسم خدارا بتائیں۔"

"بھئی تم ضدی ہو۔ ہماری زبان کھلوا کر ہی رہو گی۔ بات یہ ہے کہ ایک شریف زادی ہے۔ اب ہم کیا بولیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری شخصیت میں کچھ ایسی کشش بھر دی ہے کہ ہم ایک انار بن گئے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے' کتنی ہی بیمار ہو جاتی ہیں اور ہم

ان سے کتراتے رہتے ہیں۔"

"آپ کی کیا بات ہے حضور! آپ اتنے خوبرو اور باوقار ہیں کہ پہلی نظر میں ہوش اُڑا دیتے ہیں۔ میری تو یہ حالت ہے کہ جس رات آپ کسی دوسری کو بلاتے ہیں' اس رات میں انگاروں پر لوٹتی رہتی ہوں۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "ایک بات ایمان سے کہو' منہ دیکھی بات نہ کہنا۔ کیا ہم بوڑھے دکھائی دیتے ہیں۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "بوڑھے.......... اور آپ؟ آپ کے دل میں یہ خیال کیوں آیا.......... بیگم صاحبہ نے آپ کی عمر کا حساب کیا ہے؟"

"بیگم کے کہنے سے ہم پر بڑھاپا نہیں ہوگا۔ ہم تو دوسری شادی کرنے والے ہیں۔"

"کیا واقعی! میں آپ کو پیشگی مبارک باد دیتی ہوں۔ وہ خوش نصیب کون ہے؟"

"ایک شاعرہ ہے۔ جیسی خوبصورت ہے' ویسے ہی شعر کہتی ہے۔ بیس بائیس برس کی ہو گی۔ ہمارے مقابلے میں بہت کمسن ہے۔ یہی بات کھٹکتی ہے۔ اس کی کمسنی کے آگے ہمارا بڑھاپا صاف دکھائی دے گا۔"

"آپ خواہ مخواہ ایسی باتیں سوچ رہے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ چالیس برس کے لگتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں۔ اگر آپ بوڑھے دکھائی دیتے تو کیا وہ کمسن لڑکی آپ سے شادی کے لئے راضی ہوتی؟"

ان کا سر جھک گیا۔ وہ سوچنے لگے۔ غزل راضی ہے یا نہیں؟ یہ کل کسی وقت معلوم ہونے والا ہے۔ اصل فکر یہ ہے کہ اس کے والدین اور قریبی رشتے دار ہماری عمر کا حساب کریں گے۔ بال تو سفید نہیں ہیں۔ خضاب سے سفیدی چھپ جاتی ہے۔ ہمارا جسم جوانوں کی طرح سخت اور صحت مند نہیں ہے' لیکن ہم دبلے پتلے بھی نہیں ہیں۔ بیمار نہیں لگتے۔ ہمارے ملنے جلنے والے ہماری صحت اور بوڑھی جوانی پر رشک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا' ہم دوسری شادی کر سکتے ہیں۔ اس نے ہمیں جوان تسلیم کیا ہے' تب ہی ایسا کہا ہے۔

وہ بولی۔ "کیا اس کمسن لڑکی کے پاس پہنچے ہوئے ہیں؟"

"نہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر غصہ آتا ہے کہ دنیا والے ہماری عمر کا حساب کیوں کرتے

ہیں؟"

"آپ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ دنیا والوں کی پروا کیوں کرتے ہیں؟ اپنا سکہ کھرا ہونا چاہئے۔ لڑکی تو آپ پر مرمٹی ہے نا؟"

اس بات پر انہیں ٹھسکا لگا۔ وہ کھانسنے لگے۔ کنیز نے اٹھ کر فوراً ہی پانی لا کر پلایا۔ وہ دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گہری گہری سانس لینے لگے۔ سانسوں کی نالی میں کہیں بلغم پھنس جائے تو یہ جب تک خارج نہ ہو' کھانسی شدید جھٹکوں سے ہوتی رہتی ہے پھر بڑی مشکلوں سے سانس آتی اور جاتی ہے ان کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔

کنیز نے سمجھ لیا۔ کھانسی کا یہ دورہ جاری رہے گا۔ وہاں دو چار کنیزیں تھیں جو مختلف اوقات میں ان کی بوڑھی جوانی کو تھپکتی رہتی تھیں۔ انہیں دواؤں سے اور اپنی باتوں سے بہلا کر جوانی کے سبز باغ میں گھماتی پھراتی رہتی تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد دواؤں نے اثر دکھایا۔ کھانسی کم ہو گئی مگر سانسیں رکنے لگیں۔ کنیز نے انہیں انہیلر لا کر دیا۔ انہوں نے طریقۂ استعمال کے مطابق اسے منہ میں رکھ کر ایک بار پھر دو بار سانس کھینچی۔ چند سیکنڈ میں سانسیں بحال ہو گئیں۔ کھانسی اور دمے نے انہیں تھکا مارا تھا۔ وہ ہانپنے کے انداز میں سانس لینے لگے۔

سر دکھ رہا تھا۔ سینہ دکھ رہا تھا۔ گردن سے لے کر کمر تک تمام ہڈیاں' پسلیاں ہل کر رہ گئی تھیں۔ ان لمحات میں وہ آئینہ دیکھتے تو صاف دکھائی دیتا تھا کہ بڑھاپے نے انہیں پچھاڑ دیا ہے۔ وہ ایسی حالت میں نوجوان کنیز کا ہاتھ پکڑ کر اسے سینے سے لگا کر مستی میں کوئی شعر گنگنا نہیں سکتے تھے۔

انسان بڑا ضدی ہے۔ بڑھاپا طاری ہوتا دیکھتا ہے مگر اسے تسلیم نہیں کرتا۔ ان لمحات میں انہیں اپنا محاسبہ کرنا چاہئے تھا۔ اپنی بیماریوں اور اپنی کمزوریوں کو سمجھنا چاہئے تھا۔ یہ مان لینا چاہئے تھا کہ بڑھاپا' جوانی کے مقابل آتے ہی ہانپنے کانپنے لگتا ہے۔ تھک ہار کر اسے دور ہی دور سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ انگڑائی لے رہی تھی۔ جوانی کی بھری ہوئی بندوق کی طرح سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بندوق چلا نہیں سکتے تھے۔ عورت کو صرف ڈیکوریشن پیس بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ وہ کھلونا بندوق نہیں ہوتی اسے گھر والا نہ چلائے تو کسی شکاری کے

ہاتھ لگ کر چل پڑتی ہے۔

ان کی سانس بحال ہونے لگی۔ ذرا آرام آیا۔ کنیز ان کے بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔ انہیں سہلاتی رہی۔ تھپکتی رہی پھر وہاں سے اٹھ گئی۔ کمرے میں ایک زیرو پاور کا بلب آن کر کے تمام بتیاں بجھا دیں پھر دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آ گئی۔

رات کے دو بجے تھے۔ کوٹھی کے اندر اور باہر خاموشی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ سونے والوں کو معلوم تھا کہ روٹین کے مطابق کوئی ایک کنیز خدمت کے لئے اوپر جاتی ہے' پھر آدھی رات کے بعد نیچے آتی ہے۔ مسلح گارڈ نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ وہ کوٹھی سے باہر آ کر مہمان خانے کی طرف جانے لگی۔

رات کو خدمت گزاری کے لئے رہنے والی کنیز دوسری صبح تک مہمان خانے میں رہا کرتی تھی۔ نیم تاریکی میں ایک جوان صحت مند ملازم دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ نواب سعد اللہ جان کا ڈرائیور تھا۔ صرف ان کی کار چلایا کرتا تھا۔ اس نے آس پاس محتاط نظروں سے دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے' بڑی دیر لگا دی۔ صاحب کچھ زیادہ مہربان ہو رہے تھے۔"

"ان کی مہربانی کے پیچھے نادانی ہوتی ہے۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے' دبی ہوئی چنگاری بھڑکاتے ہیں اور خود ڈیپ فریزر بنے رہتے ہیں۔ چل آ جا.........."

وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ اندر گئی پھر دروازہ بند ہو گیا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ نئے نئے ماڈل کی مہنگی کاریں خریدتے ہیں' لیکن وہ کار خود نہیں چلا پاتے۔ ان کے ڈرائیور چلاتے ہیں۔

آدھی رات کے بعد سب ہی سو جاتے تھے۔ اس رات بھی کوٹھی کے اندر گہری خاموشی تھی لیکن بند کمروں کے اندر سب جاگ رہے تھے۔ شام کو نواب سعد اللہ جان نے بیگم ماہ لقا کے سامنے دوسری شادی کا فیصلہ سنایا تھا۔ وہ بیگم کے پاس سے اٹھ کر گئے تو بیگم کی بیوہ بہن مہوش آ گئی تھیں۔ انہوں نے دوسری شادی کی خبر سنی تو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ناراض ہو کر بولیں۔ "ماہ لقا! تم پر سوکن آ رہی ہے اور تم بڑے سکون سے یہ خبر سنا رہی ہو۔ تمہیں اپنے نقصان کا کچھ اندازہ ہے؟ سوکن کی اولاد بھائی صاحب کی وارث ہو گی۔ تمام دولت اور جائیداد اسے ملے گی۔ تمہیں خیرات کے طور پر کچھ دے

دیا جائے گا۔"

ماہ لقا نے کہا۔ "آپ کے سمجھانے سے میں سمجھ لوں گی۔ جائیں اپنے بہنوئی کو سمجھائیں کہ وہ اولاد کی تمنا نہ کریں۔"

"یہ اولاد کی نہیں' ایک نئی نویلی کی تمنا ہے۔ بھلا اس عمر میں وہ اولاد کیا پیدا کریں گے؟"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے ساٹھا پاٹھا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اولاد ہو جائے۔"

"ساٹھ برس والے کو ساٹھا کہتے ہیں۔ بھائی صاحب کی عمر ستر برس سے اوپر ہی ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے' مرد سو برس کا ہو' تب بھی باپ بن جاتا ہے۔"

"یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں۔ لوگ خالص دودھ پیتے تھے۔ خالص گھی کھاتے تھے اور بڑھاپے میں بھی پہلوانی کرتے تھے۔ بھائی صاحب نے جوانی میں کبھی پہلوانی نہیں کی۔ رنگ رلیاں مناتے کھوکھلے ہو گئے ہیں۔"

"ایسی باتیں نہ کریں آپا' سو بات کی ایک بات یہی ہے کہ انہیں کوئی دوسری شادی سے روک نہیں سکے گا۔ آپ مجھ سے توقع نہ کریں کہ میں دوسری شادی کی مخالفت کروں گی۔ انہیں یہ تاثر نہیں دوں گی کہ میں انہیں صاحبِ اولاد دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں ماں نہ بن سکی۔ یہ سراسر خود غرضی ہو گی کہ میں انہیں باپ نہ بننے دوں۔"

مہوش مایوس ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچے ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "امی! بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "مجھے کھا لو۔ ایک ہمیں کھا جانے والی آ رہی ہے۔ اس گھر سے نکال دے گی۔ یہ سارے عیش و آرام دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔"

مہوش کو اپنی فکر تھی کہ نواب صاحب کی دوسری چہیتی آئے گی تو اسے بچوں سمیت دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکے گی۔ جس بہن کے دم قدم سے رئیسانہ زندگی گزار رہی تھی' دوسری تو آتے ہی دم کھینچ لے گی۔ کوٹھی میں ایسی جھاڑو دے گی کہ سب کے سب کچرے کی طرح باہر ہو جائیں گے۔

اسد اللہ اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا رہے تھے۔ مہوش نے

آ کر بجلی گرائی۔ "اسد اللہ! اپنے بھائی جان کو مبارک باد دیں۔ وہ دوسری شادی کر رہے ہیں۔"

جس کے ہاتھ میں لقمہ تھا' ہاتھ میں رہ گیا' جس کے منہ میں لقمہ گیا تھا' وہ چبانا بھول گیا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا' پھر اسد اللہ نے کہا۔ "میں نہیں مانتا' بھائی جان دس برس پہلے اچھے خاصے صحت مند تھے۔ بھابی جان کے مفلوج ہوتے ہی دوسری شادی کر سکتے تھے۔ اس وقت انہوں نے نہیں کی۔ اب تو بیماریوں سے آدھے ہو گئے ہیں۔ اب کیا کریں گے؟"

مہوش نے کہا۔ "سانچ کو آنچ کیا؟ بھائی صاحب اوپر بیڈ روم میں ہیں۔ ابھی جائیں میری بات سچ ہو تو انہیں مبارک باد دے کر آئیں۔"

ان میں سے کسی کو اوپری منزل میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ نواب سعد اللہ جان نے ان سے کہہ دیا تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہو' کوئی بیمار ہو جائے' کوئی حادثہ پیش آئے۔ تب بھی کوئی اوپر نہ آئے۔ مجبوری میں فون پر بات کی جا سکتی ہے۔

وہ سب کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ فون کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اسد اللہ نے ریسور اٹھا کر اوپر بیڈ روم میں ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "ہاں بولو' کیا پریشانی ہے؟"

اسد اللہ نے کہا۔ "وہ........ بھائی جان آپ آرام فرما رہے ہیں۔ مداخلت کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ مہوش آپا کہہ رہی تھیں کہ آپ دوسری شادی کرنے والے ہیں۔ میں بس تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

ان کی رعب دار آواز سنائی دی۔ "تم نے درست سنا ہے۔ ابھی رشتے کی بات چل رہی ہے۔ ہماری کوشش یہی ہو گی کہ بات طے ہوتے ہی' اسی ماہ کے آخر تک شادی ہو جائے اور کچھ؟"

"میں آپ سے چھوٹا ہوں' لیکن ایک بات ضرور پوچھوں گا۔ اگر وہ ہماری نئی بھابی جان بھی بانجھ ہوئی تو؟"

"تو ہم اسے طلاق دے دیں گے اور تیسری شادی کر لیں گے کیونکہ ہماری میڈیکل رپورٹ پوزیٹو ہے۔ ہم باپ بن سکتے ہیں۔ بس اور کچھ نہ بولو ہمیں آرام کرنے دو۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔ اسد اللہ نے ریسور رکھتے ہوئے مہوش کو دیکھا۔ وہ

بولیں۔ "مقامِ فکر ہے کیا کریں؟ کیا نہ کریں؟ اب تو بھوک مرجائے گی نیندیں اُڑ جائیں گی۔"

اس نے درست کہا تھا۔ سب کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ آدھی رات سے پہلے سب سو جایا کرتے تھے۔ اس رات بستر پر کانٹے چبھنے لگے۔ مہوش چاہتی تھی کہ ماہ لقا اس کے ایک بچے کو گود لے لے۔ اس کے لئے نواب صاحب کو راضی کرلے۔ اب راضی کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ وہ کسی دوسری سے راضی ہو رہے تھے۔ ان سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ایک بچہ گود لے لیں' لیکن وہ ایک دلہن کو گود لے رہے تھے۔

اسد اللہ کی بیگم نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد کہا۔ "ایک امید تھی کہ آپ ہمارے پپو کو بھائی جان کی گود میں دے سکیں گے۔ آج یہ امید بھی دم توڑ رہی ہے۔ پتا نہیں یہ بیٹھے بیٹھائے بھائی جان کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک دم سے شادی کا فیصلہ کرلیا اور کوئی لڑکی بھی دیکھ لی ہے۔ آپ سے یہی کہہ رہے تھے ناکہ رشتے کی بات چل رہی ہے؟"

"انہوں نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا ہے۔ میڈیکل رپورٹ اور ڈاکٹروں نے انہیں حوصلہ دیا ہے۔ انہیں باپ بننے کا یقین دلایا ہے۔"

"باپ؟" بیگم نے میاں کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "کیا اس عمر میں یہ باپ بن سکیں گے؟ میڈیکل رپورٹ جو بھی کہے' ان کی بیماریوں کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟ پچھلے برس جو حکیم صاحب ان کا علاج کر رہے تھے۔ ان حکیم صاحب نے آپ سے کیا کہا تھا' یاد ہے؟"

"ہاں انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی جان نے خود کو بری طرح ضائع کیا ہے۔ اب انہیں عیش و طرب سے باز آکر گوشہ نشیں ہو کر اللہ اللہ کرنا چاہئے۔"

"یہ تو حکیم صاحب کی ہدایت کے برعکس کر رہے ہیں۔ کنیزوں سے دل بھر گیا ہے۔ اب شادی کرنے جا رہے ہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ بھائی جان کو کنیزوں سے منسوب نہ کیا کرو۔"

"میرے چپ رہنے سے کیا سچائی بدل جائے گی؟ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ یہاں کام

کرنے والی تین کنیزوں کو ڈبل تنخواہ ملتی ہے۔ بے چاریاں اوور ٹائم جو کرتی ہیں۔"

"یہ تم کیسی مذاق اُڑانے والی بات کر رہی ہو؟ مجھے توہین کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"آپ کیوں شرماتے ہیں؟ شرم تو بھائی جان کو آنی چاہئے۔ ہمارے دو بیٹے ہیں۔ ایک بیٹی ہے۔ وہ کسی کو تو گود میں لے سکتے تھے۔ آپ ہوں یا میرے بچے ہوں۔ سب ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ وہ کچھ تو خون کے رشتوں کا خیال کرتے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں۔ اس دوسری سے ان کی اولاد نہیں ہوگی۔"

اسد اللہ نے کہا۔ "ہم تو صرف دعا ہی مانگ سکتے ہیں کہ اولاد نہ ہو۔ نہیں ہوگی تب ہی ہمارے بچوں کو چانس ملے گا۔"

بیگم نے ذرا قریب ہو کر دھیمی آواز میں کہا۔ "بھائی جان کروڑوں کی جائداد کے مالک ہیں۔ فیکٹری منافع دے رہی ہے۔ وہ دوسری چالاک ہوگی تو وہ اتنا منافع نہیں چھوڑے گی۔ آپ کے بھائی جان باپ بنیں یا نہ بنیں' وہ ماں بن جائے گی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ بھائی جان باپ نہیں بنیں گے تو وہ ماں کیسے بن جائے گی۔"

"کیا اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی؟ وہ فیکٹری اور تمام جائداد حاصل کرنے کے لئے چور دروازے سے ماں بن سکتی ہے اور وہ ضرور ایسا کرے گی۔"

اسد اللہ سوچ میں پڑ گئے۔ اس گھر میں سب ہی سوچ و فکر میں مبتلا تھے۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ نواب سعد اللہ جان بھی جاگ رہے تھے۔ انہوں نے کنیز کی موجودگی میں آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ ٹل جائے۔

جوش و جنون کے لمحات میں عورت پھول کی طرح لگتی ہے اور وہ جوش جب جھاگ کی طرح بیٹھ جائے تو وہی عورت پتھر کی طرح آکر لگتی ہے۔ جب وہ کنیز چلی گئی تو وہ آنکھیں کھول کر سوچنے لگے۔

"ہم کیا کریں؟ پتا نہیں کیوں حسین عورتیں ہمارے حواس پر چھائی رہتی ہیں۔ جوانی کے ابتدائی ایام میں ہم نے خود کو لگام نہیں دی۔ ہمارے بزرگوں نے روک ٹوک کی' میں سنبھالنا چاہا لیکن ہم ان سے جھوٹ بولتے رہے۔ انہیں دھوکا دیتے رہے۔"

"آہ! آج ابا جان کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ انہوں نے نصیحت کی تھی۔

"برخوردار! موم بتی کے ایک ہی سرے کو روشن رکھو تو یہ صبح تک روشنی دے گی۔ اس کے دونوں سروں کو جلاؤ گے تو یہ آدھی رات سے پہلے ہی پگھل جائے گی۔ پھر ہوس کے اندھیرے میں ایک جگنو کی طرح چمک بھی نہیں پاؤ گے۔"

جب وقت گزر جاتا ہے تو بزرگوں کی گھسی پٹی نصیحتیں آ کر پوچھتی ہیں۔ "بولو برخوردار! اب تم کتنے گھسے پٹے رہ گئے ہو؟"

دیکھا جائے تو نواب سعداللہ جان کے اندر پچھتاوا تھا' لیکن ندامت نہیں تھی۔ ندامت ہوتی تو وہ اس عمر میں جوانی کے تقاضوں سے پرہیز کرتے۔ وہ کبھی کبھی اپنا محاسبہ کرتے تھے۔ خود کو سمجھاتے تھے۔ بس بہت ہو چکا ہے۔ ہمیں اپنا دھیان دوسری طرف لگانا چاہئے۔ اس عمر میں ایک محتاط زندگی گزاری جائے تو اپنی شخصیت سنجیدہ اور باوقار دکھائی دیتی ہے۔

وہ خوب سمجھتے تھے اور خود کو سمجھاتے تھے لیکن حسن نظر سے مجبور ہو جاتے تھے۔ ان کے اندر اتنا حسن بھرا ہوا تھا کہ وہ حسین نظاروں سے چشم پوشی نہیں کر پاتے تھے۔ پہلے سوچتے تھے کہ صرف دور سے دیکھیں گے' پھر اندر سے ضدی بچہ مچلتا تھا۔ چھو کر دیکھنا چاہئے' چھونے کے بعد جذبے ہمکتے تھے۔ پکڑنے کے بعد ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔

خواہشات اسی طرح آگے اور آگے دھکیلتے رہتی ہیں۔ پھر آخر کو بے دم کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد دم رہے نہ رہے۔ ہوس رہ جاتی ہے۔

دل قابل محبت جاناں نہیں رہا
وہ ولولہ وہ جوش' وہ طغیاں نہیں رہا
کس کام کے رہے جو کسی سے رہا نہ کام
سر ہے مگر غرور کا ساماں نہیں رہا

وہ شکست تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ انہیں یہ زعم تھا کہ ابھی وہ کام کے بندے ہیں۔

☆------☆------☆

وہ دونوں تمام رات ایک بند مکان کے ایک بند کمرے میں رات سے صبح کرتے رہے۔ اس کے ابو اسپتال میں تھے۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے امی بھی وہاں رہنے پر مجبور تھیں۔ اس خالی گھر میں حالات ان کو کھلی چھٹی دے رہے تھے۔

غزل سات بجے ہی غسل سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کر کے اسپتال جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس کے ابو کا آپریشن ہونے والا تھا۔ سکندر نے کہا۔ "آپریشن کے وقت مجھے بھی وہاں رہنا چاہئے لیکن تمہاری امی مجھ سے بدظن ہو گئی ہیں۔"

"آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ میں آپ کی طرف سے کوئی صفائی پیش نہیں کر سکوں گی۔ امی کا دل صاف نہیں ہو گا۔ آپ اپنی موجودہ روش چھوڑنا نہیں چاہتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟ آپ نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔"

"تم فضول میں الجھ رہی ہو۔ میں جیسی بھی زندگی گزار رہا ہوں' تم میری شریک زندگی رہو گی۔ میری چاہت ایسی ہے کہ تم اعتراضات کے باوجود میرے بازوؤں کی گرفت میں آتی رہو گی۔"

غزل نے بے اختیار جذبوں میں ڈوب کر اسے دیکھا پھر اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "میں نے کہا تھا۔ آپ صبح ہونے سے پہلے چلے جائیں۔ اب کیسے جائیں گے؟"

"میں چھپ کر جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم باہر نکل کر دیکھو گلی میں ذرا بھی سناٹا ہو گا تو میں چپکے سے نکل جاؤں گا۔"

غزل نے ایک کھڑکی کے پاس آ کر پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا پھر واپس آ کر بولی۔

"یہ محلے کی عورتیں دن رات کسی نہ کسی سے بولتی رہتی ہیں۔ کم بخت تھکتی نہیں ہیں۔

سامنے والے مکان کی کھڑکی سے زیب خالہ بول رہی ہیں۔ ہمارے دائیں بائیں رہنے والی پڑوسنیں انہیں جواب دے رہی ہیں۔ یہ سوال جواب لڑائی جھگڑے کی صورت اختیار کرنے والے ہیں۔ اس محلے میں جب لڑائی شروع ہوتی ہے تو شام تک جاری رہتی ہے۔ آپ کیسے جائیں گے۔"

"تم تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ ویسے بھی اتنی صبح اسپتال جا کر کیا کرو گی؟"

"امی نے کہا تھا۔ آج نو بجے صبح آپریشن ہو گا۔ میں آپریشن سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتی ہوں۔ ابو کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہیں پیار کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بھئی مجھے پیار کر لو۔"

"پلیز! مذاق نہ کریں۔ ابو کے لئے میرے جذبات کو سمجھیں۔ گلے کا آپریشن ہے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟"

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ سکندر نے کہا۔ "سوری.......... تم ایسا کرو باہر سے تالا لگا کر چلی جاؤ۔ میں تمہاری واپسی تک یہاں خاموشی سے وقت گزاروں گا۔"

"واپسی میں میرے ساتھ امی آ سکتی ہیں۔ وہ آپ کو یہاں دیکھ کر اور غصے سے بھڑک جائیں گی۔"

"آپریشن کے بعد انکل کے پاس رہنا ضروری ہے۔ انہیں جا کر سمجھانا۔ ایسا کرو انہیں اور رقم جا کر دو۔ ان کی فکر اور پریشانیاں دور ہوں گی۔ وہ کسی اچھے ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھا سکیں گی۔ انہیں کسی طرح بھی سمجھا کر اسپتال میں ہی رہنے دو۔"

وہ سوچنے لگی۔ اندر سے وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ نہ جائے۔ رگِ جاں سے قریب رہے اور اس کی جان لیتا رہے۔ اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے دیکھ کر وہ آگے بڑھنے کے تمام رستے بھول جاتی تھی۔ دل نے کہا کہ ایسی کوئی صورت نکلے کہ وہ آیا ہے تو کہیں نہ جائے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "میں امی کو سمجھاؤں گی۔ انہیں ابو کے پاس رہنے کو کہوں گی۔"

اس نے کمرے میں آ کر الماری کھولی۔ اس میں سے دو ہزار روپے نکالے۔ تین ہزار وہ پہلے دے چکی تھی۔ اس نے سوچا مزید دو ہزار کافی ہوں گے۔ امی اخراجات کی

طرف سے مطمئن ہو کر میری بات مان لیں گی۔ وہیں ابو کے پاس رہ جائیں گی۔

ویسے تو وہ گھر اور اسپتال کے اخراجات پورے کر رہی تھی۔ بزرگوں کی توقعات سے زیادہ ذمے داریاں نبھا رہی تھی لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ محبوب کی قربت کے لئے ماں کو رشوت دینے جا رہی تھی۔

وہ رقم لے کر سکندر کے پاس آئی۔ اس سے بولی۔ "میں جا رہی ہوں۔ باہر سے دروازے کو تالا لگا دوں گی۔ میں جانتی ہوں آپ محتاط رہیں گے، پھر بھی کہتی ہوں آپ کی آواز باہر نہ جائے۔ کسی طرح کی آہٹ ہو گی تو لوگوں کو شبہ ہو گا۔"

"تم اطمینان رکھو۔ میری سانس کی آواز بھی باہر نہیں جائے گی۔"

اچانک اسے چھینک آئی۔ "آنک.......... چھیں۔" ایک بار چھینکنے کے بعد دوسری چھینک آتے آتے رہ گئی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "خدا کے لئے ایسے وقت تولیہ یا رومال منہ پر رکھ لیں۔ آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ سانسوں کی آواز بھی باہر نہیں جائے گی۔ یہ قدرت کا اشارہ ہے کہ اچانک آ جانے والی چھینکوں یا کھانسیوں کو آپ روک نہیں پائیں گے۔"

"میں ایک تولیہ اپنے پاس رکھوں گا۔ تم یہاں سے مطمئن ہو کر جاؤ۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دونوں چونک گئے۔ غزل نے کہا۔ "دودھ والا ہو گا۔"

سکندر نے کہا۔ "کوئی پڑوسن بھی ہو سکتی ہے۔ اندر آ سکتی ہے۔"

"آپ یہیں کمرے میں رہیں۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ کمرے سے نکل کر تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "کون ہے؟"

باہر سے ماں کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

ایک لمحے کے لئے اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ باپ کا آپریشن ہونے والا ہے اور ایسے وقت ماں یہاں چلی آئے گی۔ اس کی عقل نے سمجھایا کہ سب سے پہلے سکندر کو خطرے سے آگاہ کرنا چاہئے۔ اس نے صحن کی طرف دیکھا پھر چیخ کر بولی۔ "امی.......... ! آپ.......... ؟ آپ اچانک کیسے آ گئیں؟ آپ کو تو اسپتال میں ہونا چاہئے۔ وہاں ابو کا آپریشن ہونے والا ہے اور آپ یہاں آ گئی ہیں۔

امی.......... ! خیریت تو ہے؟ آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟ امی.......... !"

باہر سے امی کی آواز سنائی دی۔ "کیا امی' امی کی رٹ لگا رکھی ہے؟ چیختی جا رہی ہو۔ دروازہ تو کھولو۔"

"امی! میرے دونوں ہاتھ خالی نہیں ہیں۔ امی.......... میں اسے کچن میں رکھ کر آ رہی ہوں۔"

وہ دوڑ کر سکندر کے کمرے میں آئی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے دھیمی سے آواز میں پوچھا۔ "آپ کہاں ہیں؟"

وہ بیڈ کے نیچے سے سر نکال کر بولا۔ "یہاں ہوں؟"

"وہیں چھپے رہیں۔ امی آئی ہیں۔ میں دروازہ کھولنے جا رہی ہوں تولیہ اپنے پاس رکھ لیں۔"

وہ دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئی۔ ماں کی آواز سنائی دی۔ "توبہ ہے۔ پتا نہیں کیا کر رہی ہے؟ ایک دروازہ کھولنے میں گھنٹوں لگا دیئے۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے اندر آتے ہوئے اسے غور سے دیکھا اور پھر پوچھا۔ "یہ تم ہانپ کیوں رہی ہو؟ گھر کے اندر کہاں بھاگتی پھر رہی تھیں؟"

"وہ پانی کی بالٹی دوسرے غسل خانے میں لے جا رہی تھی۔ آپ میری بات چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ ابو کو چھوڑ کر کیوں آئیں ہیں؟"

"آج آپریشن نہیں ہو گا۔ ڈاکٹروں نے کل پر ٹال دیا ہے۔"

وہ چارپائی پر بیٹھ کر پسینہ پونچھتے ہوئے بولیں۔ "پنکھا تو چلاؤ' پانی تو پلاؤ۔ ایسے تک رہی ہو جیسے میں عجوبہ ہوں۔ اچانک کہیں سے چلی آئی ہوں۔"

اس نے سوئچ بورڈ کے پاس آ کر پنکھا چلایا پھر پانی لانے گئی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک بیٹی میں تبدیلیاں آ گئی ہیں لیکن تبدیلیاں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسی پرائی پرائی سی ہو گئی ہے۔

وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر آئی۔ اسے ماں کو دیتے ہوئے پوچھا۔ "ابو کیسے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔ کل آپریشن ہو جائے گا۔ گلے میں وہ آلہ لگ

جائے گا تو پھر سانس لینے میں دشواری نہیں ہو گی۔"

انہوں نے دو چار گھونٹ پینے کے بعد صحن کی طرف دیکھا۔ غزل کو یوں لگا جیسے وہ صحن کے پار اس کمرے میں سکندر کو دیکھ رہی ہوں۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ "آپ ابھی واپس جائیں گی؟"

"ابھی آئی ہوں۔ ابھی کیسے چلی جاؤں؟ وہاں ایک بنچ پر تمام رات سکڑ سمٹ کر سوتی ہوں۔ یہاں ہاتھ پاؤں پھیلا کر نیند پوری کروں گی' پھر شام کو جاؤں گی۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ خالی گلاس لے کر جانے لگی۔ ماں نے پوچھا۔ "کیا وہ پولیس والے دوبارہ آئے تھے؟"

"نہیں۔" وہ سکندر کے ذکر سے کترانا چاہتی تھی۔ کچن میں آ گئی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "تعجب ہے پولیس والے بڑی رقم مانگ رہے تھے پھر کیوں نہیں آئے؟"

"سکندر کے دوست آئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ سکندر پر بم دھماکے کا الزام جھوٹا تھا۔ اصل مجرم پکڑے گئے ہیں۔"

"اس پر جھوٹا الزام ہی سہی مگر یہ تو پکی بات ہے' وہ بدمعاشوں کی زندگی گزار رہا ہے۔ اسے تو میں یہاں قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی۔"

غزل کو محسوس ہوا کہ اس کی امی کی آواز دور ہوتی جا رہی ہے۔ وہ صحن کی طرف جا رہی تھی۔ وہ کچن سے دوڑتے ہوئے آئی' پھر ہانپتے ہوئے بولی۔ "آپ صحن میں کیوں آ گئیں؟"

انہوں نے پوچھا۔ "کیا یہاں آنا منع ہے؟"

"یہاں دھوپ ہے' کمرے میں چلیں۔ وہاں پنکھے کے نیچے آرام سے سو جائیں۔"

"مجھے اسی کمرے میں آرام ملتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ سکندر کے کمرے میں آ گئیں۔ غزل تیزی سے ان کے ساتھ آئی۔ وہ بیڈ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ نیچے وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بولی۔ "یہاں آرام نہیں ملے گا۔ ایک بجے کمرے کے اندر دھوپ آ جاتی ہے۔"

"اچھا ہے۔ ایک بجے آنکھ کھل جائے گی پھر میں غسل کروں گی۔ کھانا کھاؤں گی اور اسپتال جانے کا وقت ہو جائے گا۔"

یہ کہتے کہتے وہ بستر پر بیٹھ گئیں۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "وہ کمرا ٹھنڈا ہے۔ وہاں چلیں۔ میں آپ کے ہاتھ پاؤں دبا دوں گی۔ نیند آ جائے گی۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولیں۔ "کیا اس کمرے میں ہاتھ پاؤں دبانے کی ممانعت ہے؟ یہاں بھی تم خدمت کر سکتی ہو؟"

وہ بستر پر لیٹ گئیں۔ کمر سیدھی کرتے ہوئے کراہنے لگیں۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے آنکھیں بند کریں۔ میں پاؤں دبا رہی ہوں۔"

انہوں نے اس کی طرف کروٹ لے کر آنکھیں بند کیں۔ اس طرح ان کا رخ بیٹی کی طرف رہا۔ بیٹی جھک کر بیڈ کے نیچے سکندر کو نہیں دیکھ سکتی تھی اس کی امی اچانک آنکھیں کھول کر پوچھ سکتی تھیں کہ بیڈ کے نیچے کیا دیکھ رہی ہو؟

وہ بستر کے سرے پر اپنے پاؤں فرش پر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ نیچے چھپا ہوا سکندر اس کے خوبصورت پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ محبت کرنے والے پاؤں' اس کی ناہموار اور کانٹوں بھری زندگی میں لہولہان ہونے والے تھے۔ اسے احساس تھا کہ وہ اپنے ساتھ اسے بھی ڈبونے والا ہے لیکن وہ دل سے مجبور تھا۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں بس اسی ایک آنچل کا سایہ تھا جو اسے مل رہا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے اس کے ایک پاؤں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ غزل بیٹھے بیٹھے ایک دم سے تن گئی۔ بجلی کی ایک لہر پاؤں سے اٹھی اور سارے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ اس نے پاؤں کو ہولے سے جھٹک کر اشارتاً سمجھایا کہ وہ ایسی حرکت سے باز رہے لیکن وہ باز آنے والا نہیں تھا۔ اس نے پاؤں کو پھر چھو لیا۔

وہ ڈر رہی تھی۔ اس کی امی دیکھ نہیں سکتی تھیں کہ بیڈ کے نیچے کیا ہو رہا ہے؟ لیکن دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھ نہ لیں۔ ایسے ہی اندیشوں میں وہ پاؤں دبانا بھول گئی۔ ماں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم کیسے دبا رہی ہو؟ لگ رہا ہے صرف چھو رہی ہو۔ تمہارا دھیان کدھر ہے؟"

انہوں نے یہ کہتے کہتے کروٹ بدلی۔ غزل کی جان میں جان آئی۔ اِدھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں رینگتے ہوئے پائنچے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ وہ دھیرے

دھیرے اپنا پاؤں جھٹکنے لگی۔ اس کی انگلیاں گستاخ ہو رہی تھیں۔ پائنچے سے اوپر کوہ پیمائی کی جسارت کر رہی تھیں۔ وہ پیروں کو سمیٹ کر بستر پر رکھ سکتی تھی لیکن ایسی گستاخی بھلی لگ رہی تھی۔ ایسی بھلائی اس کے دل کو گدگدا رہی تھی۔

وہ پاؤں دبانے کے بعد کمر دبانے لگی۔ ذرا اُچک اُچک کر دیکھنے لگی کہ وہ سو رہی ہیں یا نہیں؟ ایسے وقت بیڈ کے نیچے سے کھنکارنے کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا گئی۔ اس نے پہلے ماں کو دیکھا پھر جھک کر بیڈ کے نیچے جھانکا۔ سکندر تولیہ منہ میں ٹھونسے کھنکارنے کی آواز کو دبا رہا تھا۔ اس نے غزل کو دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ اسے پیاس لگی ہے۔

اُدھر ماں کی آواز سنائی دی۔ "اب تم دباتے دباتے کہاں چلی گئیں؟ اسپتال کے تختے پر سوتے سوتے کمر اکڑ گئی ہے۔ ذرا یہاں زور سے دباؤ۔"

وہ سیدھی ہو کر کمر دابتے ہوئے بولی۔ "دبا رہی ہوں۔ آپ سو تو جائیں' اسپتال جانا ہے۔ کب سوئیں گی؟ کب اٹھیں گی؟ کب جائیں گی؟"

"توبہ ہے۔ تُو نے مجھے سلانے کی قسم کھالی ہے۔"

وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھر رہا تھا۔ "کیا سکندر یہاں آتا ہے؟ مجھے حالات نے مجبور کر دیا۔ جوان لڑکی کو گھر میں تنہا چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ ہائے.......... سوچا تھا کہ سکندر سے رشتے کی بات چلاؤں گی۔ غزل کے ابو بھی راضی تھے مگر وہ نامراد نہ جانے کن چکروں میں پڑ گیا ہے؟" انہوں نے ہمدردی سے سوچا۔ "ہو سکتا ہے اس پر دہشت گردی کا جھوٹا الزام ہو۔ لڑکا اچھا بھلا ہے۔ اچھی بھلی نوکری کر رہا تھا۔ وہ نوکری نہ رہی۔ پتا نہیں کیا کرتا پھر رہا ہے؟"

وہ پھر اس کی مخالفت میں سوچنے لگی۔ "کوئی کام دھندا نہیں ہے تو پھر یہ ہزاروں روپے کہاں سے لے آتا ہے؟ پولیس والے پاگل نہیں ہیں کہ اسے تلاش کرتے پھرتے ہیں؟"

غزل نے ذرا سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سو رہی ہیں یا سوچوں میں گم ہیں؟ اس نے فوراً ہی پلٹ کر بیڈ کے نیچے جھک کر اسے اشارے سے کہا۔ "نیچے سے نکلیں۔ کمرے سے باہر چلے جائیں۔"

وہ رینگتا ہوا بیڈ کے نیچے سے نکلا۔ ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ کر کے لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ اسی طرح رینگتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ ”اللہ کرے‘ وہ اب یہاں کبھی نہ آئے۔ جوان لڑکی تنہا رہتی ہے۔ محلے والوں نے دیکھ لیا تو بدنامی بارود کی طرح دور تک دھماکے کرے گی۔ میں کتنوں کو جواب دیتی پھروں گی؟ یہ لڑکی تو اس کے لئے باؤلی ہو رہی ہے۔ وہ یہاں آئے گا تو یہ اس کے لئے دروازہ ضرور کھولے گی۔ خدا کرے کہ وہ اِدھر کا راستہ بھول جائے۔ خدا کرے کہ پولیس والوں کی گولی اسے ٹھنڈا کر دے۔“

یہ خیال آتے ہی ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی۔ ”انہوں نے دل ہی دل میں توبہ کی۔ میں کیوں اس کا برا چاہ رہی ہوں؟ یہ کیوں بھول رہی ہوں کہ اس کی دی ہوئی رقم ہمارے بُرے وقت میں کام آ رہی ہے۔ مجھے اس کا احسان ماننا چاہئے۔ ہم بزرگ ہیں۔ اگر بچے گمراہ ہو جائیں تو ان کے لئے صرف دعا کر سکتے ہیں۔ یا اللہ! سکندر کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔“

غزل کا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ پتا نہیں وہ کمرے سے نکل کر کہاں گئے ہوں گے؟ انہوں نے پانی پی لیا ہوگا۔ یہ تو سمجھنے والی بات ہے کہ وہ گھر سے باہر نہیں جا سکیں گے۔ پتا نہیں گھر میں کہاں چھپتے پھر رہے ہوں گے؟“

ایسے وقت اس نے دل کی گہرائیوں سے سوچا۔ ”یا اللہ! سکندر اگر غلط راستے پر نہ چلتے‘ امی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاتے تو آج یوں چوروں کی طرح چھپتے نہ پھرتے۔ یہ اپنی روش نہیں بدلیں گے تو امی اور ابو میرا ہاتھ کبھی ان کے ہاتھ میں نہیں دیں گے۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟“

تھوڑی دیر بعد اسے ماں کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دیئے۔ وہ آہستگی سے سرک کر بیڈ سے اتر گئی۔ اس نے آہستہ سے پکارا۔ ”امی!“

انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ جواب نہیں دیا۔ وہ سوچتے سوچتے گہری نیند میں ڈوب چکی تھیں۔ غزل دبے پاؤں چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔ صحن سے گزرتے ہوئے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوسرے کمروں میں‘ پھر باتھ روم میں جا کر اسے تلاش کیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں آہستگی سے پوچھا۔ ”آپ

کہاں ہیں؟“

سکندر نے بیڈ کے نیچے سے سر نکال کر کہا۔ ”یہاں ہوں۔“

اس نے گھبرا کر اسے دیکھا‘ پھر پلٹ کر دروازے کے پاس آ کر اسے اندر سے بند کر دیا۔ وہ رینگتے ہوئے نیچے سے نکل کر بولا۔ ”تمہارے ساتھ رہوں گا تو بیڈ کے نیچے سونے کی عادت ڈالنی ہوگی۔“

”آپ کو تو بیڈ کے نیچے چھپنے کی جگہ مل گئی ہے۔ مجھے تو اپنے آنچل میں بھی چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی جیسی زندگی آپ گزار رہے ہیں‘ کیا اس پر میں فخر کر سکوں گی؟ کیا ابو کبھی میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیں گے؟“

”تم مجھے طعنے دے رہی ہو۔ میں اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ پولیس والے پھر میرے پیچھے پڑ جائیں اور پارٹی لیڈر میرا دشمن بن جائے۔“

”آپ اپنی جگہ مجبور ہیں‘ میں اپنی جگہ مجبور ہوں۔ جب ابو کا آپریشن ہو جائے گا تو پھر ہم کیسے ملیں گے؟ وہ آپ کو یہاں آنے سے منع کر دیں گے۔“

”تم چاہو گی تو وہ مجھے یہاں آنے سے نہیں روکیں گے۔ تمہارا ہاتھ دینے والا ہے۔ اوپر رہتا ہے۔ ان کا ہاتھ لینے والا ہے‘ وہ نیچے رہتا ہے۔ تم نے گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔ اپنے بیمار ابو کے لئے مسیحا بنی ہوئی ہو۔ ان حالات میں وہ تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کریں گے۔“

”آپ نے میرے ابو کے مزاج کو ابھی سمجھا ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی بیماری اور اپنے مصائب کو بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے میری نیک نامی اور بہترین مستقبل کا حساب کریں گے۔ میں آپ کے ساتھ ناہموار راستے پر چل سکتی ہوں۔ آگے گڑھا ہو تو آپ کے ساتھ اس میں گر سکتی ہوں‘ لیکن ابو مجھے گرنے نہیں دیں گے۔ کسی بھی ناہموار راستے پر چلنے نہیں دیں گے۔“

وہ اسے قائل کرنا چاہتی تھی۔ اسے ہر پہلو سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اپنی ہی بات منوا رہا تھا۔ ”تم تو خواہ مخواہ بحث کر رہی ہو۔ جب مسائل کچلنے لگتے ہیں اور بیماریاں موت بن کر دھمکیاں دینے لگتی ہیں تو بڑے بڑے غیرت مند عزتِ نفس کو بھول کر بیٹی کی کمائی پر تکیہ کرنے لگتے ہیں۔“

غزل کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ وہ اس کے ابو کے لئے یہ دل توڑنے والی رائے قائم کر رہا تھا کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر بے غیرت بن سکتے ہیں۔ وہ سخت لہجے میں بولی۔

"آپ میرے ابو کی توہین کر رہے ہیں۔ آنے والا وقت آپ کو بتائے گا کہ وہ کس طرح اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ آئندہ آپ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں تو بہتر ہو گا۔"

وہ شرمندہ سا ہو کر بولا۔ "تم ناراض ہو گئیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا.........."

"آپ جو بھی کہنا چاہیں، میں یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ آئندہ آپ کی کمائی اس گھر میں نہیں آئے گی۔"

وہ تیزی سے الماری کے پاس آئی۔ سکندر نے اسے دس ہزار دیئے تھے۔ اس میں سے تین ہزار اپنی امی کو دے چکی تھی۔ اس نے الماری کھول کر پانچ ہزار نکالے۔ گریبان کے دو ہزار بھی وہیں رکھے ہوئے تھے۔ اس نے وہ پورے سات ہزار لا کر سکندر کی اوپری جیب میں ٹھونس دیئے۔

وہ ایک دم سے بوکھلا کر بولا۔ "ارے.......... ارے.......... یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ.......... یہ رقم میری نہیں تمہاری ہے۔ میری ساری کمائی تمہارے لئے ہے۔"

"بے شک، آپ کی تمام کمائی میرے لئے ہے۔ میں قبول کروں گی لیکن اس وقت جب آپ مجھے دلہن بنا کر لے جائیں گے۔ یہ میرا اور آپ کا ذاتی معاملہ ہے، مگر یہ کمائی اس گھر میں نہیں آئے گی۔ میرے امی ابو داماد کی کمائی نہیں کھائیں گے۔"

"تم ایسا غصے میں کہہ رہی ہو۔ تمہارے ابو ملازمت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اس گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ جذباتی نہ بنو۔ میری بات کو سمجھو۔"

"میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ اب تک میں ان کی بیٹی نہیں بیٹا بن کر رہتی آئی ہوں۔ آئندہ بھی بیٹا بن کر ملازمت کروں گی۔ نہ انہیں کسی کا محتاج ہونے دوں گی اور نہ ہی کسی کا احسان اٹھانے دوں گی۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت حوصلہ مند ہو۔ بیٹا بن کر اپنے والدین کا سہارا بن چکی ہو لیکن مجھے غیر کیوں سمجھ رہی ہو؟ اس گھر میں میری کمائی آئے گی تو ان پر احسان نہیں

ہو گا۔ داماد بھی تو بیٹوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

"چور دروازوں سے آنے والوں کو داماد نہیں کہتے۔"

سکندر نے شکست خوردہ انداز میں اسے دیکھا پھر کہا۔ "تم انہیں راضی کر لو گی تو پھر کسی چور دروازے کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

"آپ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ میں آپ کے ہزاروں روپے سے اپنے بزرگوں پر دباؤ ڈال کر اپنی بات منوا سکتی ہوں۔ میں آپ کو صاف صاف کہہ دیتی ہوں کہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کروں گی اور نہ میرے بزرگ ایسے بے غیرت ہیں کہ اپنے مقام سے گر جائیں۔"

وہ بڑے پیار سے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر بولا۔ "میری جان! ہمیں تنہائی نصیب ہوئی ہے۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ کوئی مداخلت کرنے والا نہیں ہے۔ ہمیں پیار و محبت سے یہ وقت گزارنا چاہئے۔"

اس کے پیار کی نرمی اور گرمی اسے پگھلا دیتی تھی۔ اس نے ذرا سا اس کے بازوؤں کو پکڑا تھا۔ وہ اس کے بازوؤں میں پگھلنے لگی۔ وہ اس کے چہرے پر جھک کر سرگوشی میں کہنے لگا۔ "تم میری ہو۔ میری مرضی سے زندگی گزارو گی۔ میں جو کہوں گا' وہ کرو گی۔ اس لئے میری کمائی کا ایک ایک پیسہ تمہارے لئے ہے۔ تم اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کرو گی۔"

اسے انکار تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے خاموشی کی مہر لگا دی۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔ وہی اس سے بولتا رہا اور اسے منہ زور جذبوں سے تولتا رہا۔ وہ نڈھال سی ہو کر بے اختیار ہارتی چلی گئی۔

اس کی امی جس کمرے میں سو رہی تھیں۔ وہاں ایک بجے تک دھوپ رینگتے ہوئے بستر کی طرف چلی آتی تھی۔ گرمی کی شدت سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چھت کی طرف دیکھ کر سوچنے لگیں، کیا اسپتال میں ہوں؟ کیا ان کے گلے کا آپریشن ہو چکا ہے؟ معاً خیال آیا کہ وہ لکڑی کے تختے پر نہیں، آرام دہ بستر پر ہیں اور اپنے گھر میں ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں پھر دھیمی آواز میں پکارا!۔ "غزل!"

وہ دور اپنے کمرے میں تھی۔ وہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ بیڈ سے اتر کر

کمرے سے باہر آئیں پھر صحن سے گزر کر فریج کے پاس آ کر ٹھنڈا پانی پینے لگیں جب کلیجہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے پھر آواز دی۔ "غزل! کہاں ہو؟"

ماں کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سکندر نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "امی آ رہی ہیں۔ آپ بیڈ کے نیچے جائیں۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔"

وہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھیں۔ انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پوچھا۔ "دروازہ بند کر کے سو رہی تھیں۔"

وہ اس سوال پر گھبرا گئی۔ ماں کی نظریں الٹرا ساؤنڈ مشین لگ رہی تھیں۔ اندر کیا ہو رہا ہے؟ جیسے وہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان سے نظریں چرا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "جب سے تنہا رہنے لگی ہوں' دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہوں۔ اب تو عادت سی پڑ گئی ہے۔"

وہ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے گئی تھی۔ انہیں یوں لگا جیسے کوئی بھرپور جوان عورت گزر گئی ہے۔ اس کے اندر جانے کیسی کیسی تبدیلیاں آ گئی تھیں؟ فی الوقت ایک ہی تبدیلی سمجھ میں آئی کہ وہ پہلے جیسی معصوم نہیں لگ رہی تھی۔ کبھی کبھی کچھ سچائیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ میں آنا چاہتی ہیں لیکن سمجھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انہیں جھٹلانے سے ہی بات بنتی ہے۔

غزل کو یہ فکر تھی کہ امی اس کمرے میں نہ چلی جائیں۔ اس نے کہا۔ "امی! دیر نہ کریں۔ ابھی آپ کو غسل کرنا ہے۔ روٹی کھانی ہے پھر اسپتال جانا ہے۔"

وہ اپنے کمرے میں گئی تھیں۔ وہاں سے کپڑے لے کر غسل خانے کی طرف جانے لگیں۔ "مجھے غسل کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ بس یہ گئی اور یہ آئی۔ تم روٹیاں پکاؤ۔"

وہ غسل خانے میں چلی گئیں۔ غزل کو ان پر بڑا ترس آیا۔ ان کی عمر اور صحت ایسی نہیں تھی کہ وہ بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھاتی پھرتیں۔ حالات نے مجبور کر دیا تھا۔ اگر اچھی خاصی آمدنی ہوتی تو باپ کا علاج پرائیوٹ ہسپتال میں ہوتا۔ چار پہیوں کی نہ سہی دو پہیوں کی موٹر سائیکل ہی ہوتی۔ وہ بسوں میں خوار نہ ہوتیں۔ کوئی نہ کوئی انہیں اسپتال پہنچا دیا کرتا۔ سرکاری اسپتالوں میں سوتیلوں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ ڈاکٹرز کی مرضی سے آج کا آپریشن کل پر ٹال دیا جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ مریض کے گھر والے گھر سے

اسپتال تک کس طرح رلتے رہتے ہیں۔ پتا نہیں لوگ دوسروں کی تکالیف کا احساس کیوں نہیں کرتے؟

غزل کو بھی اپنی خود غرضی کا احساس ہوا۔ وہ ماں کو جلدی گھر سے رخصت کر دینے کی دھن میں لگی ہوئی تھی۔ وہ انہیں دو گھڑی آرام کر لینے دیتی تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ سکندر چوروں کی طرح چھپا تھا۔ چھپا ہی رہتا لیکن ماں کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ اس کمرے میں نہ چلی جائیں۔ سکندر نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

اس کی امی غسل خانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئیں اور اپنے بالوں کو خشک کرنے اور سلجھانے لگیں۔ اس نے ایک ٹرے میں کھانا لا کر رکھتے ہوئے کہا۔ "کھانا گرم ہے جلدی سے کھا لیں۔"

وہ جانے لگی' انہوں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ کیا تم نہیں کھاؤ گی؟"

"آپ کے جانے کے بعد غسل کروں گی پھر کھاؤں گی؟"

وہ کمرے سے باہر آئی۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور سوچا۔ "اب کون آ گیا؟ پڑوسن ہو گی تو امی کو باتوں میں لگا لے گی اور امی جب باتیں کرنے بیٹھتی ہیں تو انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ سکندر وہیں بیڈ کے نیچے بھوکے پیاسے پڑے رہیں گے۔"

دوسری کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے بند دروازے کے قریب آ کر پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے آواز سنائی دی۔ "غزل..........! میں ہوں.......... ہمنوا۔"

وہ ان کی آواز سنتے ہی خوش ہو گئی۔ پہلی بار استاد محترم اس کے گھر آئے تھے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ کئی بار ان سے رابطہ کرنا چاہا لیکن حالات نے اجازت نہیں دی تھی۔ وہ ان سے مل کر شعر و ادب کے حوالے سے گفتگو کرتی تھی۔ اسے ایک طرح کی روحانی مسرتیں حاصل ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ مسرتیں چند لمحوں کے لئے حاصل ہوئی تھیں۔ پھر مستی میں ناچتے ہوئے مور کو اپنے بھدے پاؤں نظر آ گئے۔

اسے فوراً یاد آ گیا کہ سکندر اس کے کمرے میں ہے۔ ہمنوا صاحب یہاں دو گھنٹے بیٹھے رہیں گے۔ اپنی غزلیں سنانے کا سلسلہ جاری رکھیں گے تو وہ بیڈ کے نیچے بیزار ہوتے

رہیں گے اور ان کی شاعری پر کڑھتے رہیں گے۔

اسے ہمنوا صاحب کی آواز سنائی دی۔ "غزل! کہاں ہو؟ دروازہ نہیں کھولو گی؟"

وہ ایسی گستاخی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ انہیں دیکھتے ہی سلام کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لئے فخر کی بات ہے کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ آیئے......... اندر آیئے۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ ہمنوا اندر آتے ہوئے بولے۔ "میں کوئی رئیس ابن رئیس نہیں ہوں۔ ایسا ہی چھوٹا سا میرا بھی گھر ہے۔ یوں 'سمجھو' میں اپنے ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں آ گیا ہوں۔"

وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

استاد ہمنوا صاحب پہلی بار ان کے گھر آئے تھے۔ اس کے ابو سے باہر ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی امی نے صرف ان کا ذکر سنا تھا۔ اس نے کمرے میں آ کر ان سے کہا۔ "میرے استاد شاعر ہمنوا آئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ آپ کھانے سے فارغ ہو کر آ جائیں۔"

وہ بولیں۔ "پھر تو شعرو شاعری میں تمہارا اچھا وقت گزرے گا۔"

وہ پھر ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کا سارا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ سکندر نے کال بیل کی آواز سنی تھی۔ پھر گھر کے اندر سے ہمنوا صاحب کی باتیں سنائی دی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ "یہ کون سی نئی مصیبت آ گئی ہے؟ پتا نہیں یہ آنے والا مہمان کب تک یہاں بیٹھا رہے گا؟" وہ اس بات پر جھنجلا رہا تھا کہ غزل کو اس کے پاس آنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔

ہمنوا نے غزل کو دیکھ کر کہا۔ "تین ماہ گزر چکے ہیں۔ نہ تم نے مجھ سے رابطہ کیا اور نہ ہی نواب صاحب کے گھر مشاعرے میں آئیں۔ تم کہاں ہو؟ کیا شعر کہنے سے توبہ کر لی ہے؟"

"آپ سے رابطہ نہ کرنے پر معافی چاہتی ہوں۔ زندگی کے مسائل نے مجھے بری طرح الجھا دیا ہے۔ ابو اسپتال میں ہیں۔ کل ان کا آپریشن ہونے والا ہے۔ گھر کی ساری

ذمہ داریاں مجھ پر آن پڑی ہیں۔"

"اسپتال کے اخراجات تو مریض کے گھر والوں کو بھی بیمار ڈال دیتے ہیں۔ تمہاری تنخواہ میں کیسے گزارہ ہو رہا ہے۔"

"ملازمت ہی نہیں ہے تو تنخواہ کہاں سے آئے گی۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی؟ تم نے بتایا تھا کہ تمہارے بھائی جان بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔ یہاں کمانے والا اور کوئی نہیں ہے' پھر ذرائع آمدنی کے بغیر تم مسائل کا سامنا کیسے کر رہی ہو؟"

وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ چور دروازے سے آنے والی آمدنی دنیا والوں سے چھپائی جاتی ہے۔ وہ کما نہیں رہی تھی مگر کمائی گھر میں موجود تھی۔ کمانے والا بھی گھر میں چھپا ہوا تھا لیکن وہ اس کی صورت کسی کو دکھا نہیں سکتی تھی۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "جی ہاں' آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ امی کپڑے سلائی کرتی ہیں۔ اچھے دنوں میں کچھ رقم بچائی تھی' وہ اب کام آ رہی ہے۔ بس کسی طرح گزارہ ہو رہا ہے۔"

"اس مہنگائی کے دور میں بیٹھے بیٹھے کھاتے رہو تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ تمہاری امی کی بچائی ہوئی رقم کب تک ساتھ دے گی۔ کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔"

اس کی امی نے آ کر ہمنوا صاحب کو سلام کیا۔ غزل نے کہا۔ "یہ میری امی ہیں۔ آج کل گھر میں کم اور اسپتال میں زیادہ رہتی ہیں۔"

اس کی امی نے کہا۔ "کوئی مجبوری سی مجبوری ہے بھائی صاحب! جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ اِدھر دھیان اٹکا رہتا ہے اُدھر اسپتال میں جان اٹکی رہتی ہے۔ ایسے وقت ایک ہی دعا دل سے نکل سکتی ہے کہ کسی اچھے گھرانے سے رشتہ آ جائے تو اسے عزت و آبرو سے رخصت کر دوں۔"

غزل نے ناگواری سے منہ بنایا پھر وہاں سے اٹھ کر کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی۔ "امی کے ذہن میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ میں نے سکندر سے دس ہزار روپے لئے ہیں۔ میں مشکوک ہوں۔ وہ مجھے یہاں سے رخصت کر کے بیٹی کو عزت و آبرو

سے رخصت کرنے کا بھرم رکھنا چاہتی ہیں۔"

ہمنوا صاحب نے اس کی امی سے کہا۔ "میں آپ کی الجھنوں اور مصائب کو سمجھ رہا ہوں پھر کمائی کا ذریعہ نہ ہو تو مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"غزل ایک اچھے سکول میں پڑھاتی تھی۔ وہاں سے جواب مل گیا ہے۔ اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے تو گھر کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔"

"اسے تو ایک اچھی ملازمت کی پیشکش کی گئی تھی۔ پتا نہیں وہاں کیوں نہیں گئی۔"

"میں نے اسے سمجھایا تھا جب فیکٹری کا ماحول اچھا ہے تو اسے ملازمت کرنی چاہئے لیکن پتا نہیں وہ کیوں ٹال رہی ہے؟"

وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ بیٹی کیوں ٹال رہی ہے؟ کس پر تکیہ کر رہی ہے؟ استاد ہمنوا سوچ رہے تھے کہ نواب صاحب کے مطلب کی بات کیسے شروع کریں۔ انہوں نے کہا۔ "نواب سعداللہ جان بہت عظیم انسان ہیں۔ وہ حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں۔ غزل سے بہت متاثر ہیں۔ وہ اس کے دکھ سکھ میں کام آنا چاہتے ہیں۔ ابھی آپ فرما رہی تھیں کہ اچھے گھرانے سے رشتہ آئے تو غزل کے ہاتھ پیلے کر دیں گی۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔ غزل ایک ہاتھ میں چائے لے کر آئی۔ وہ اس سلسلے میں ماں بیٹی سے الگ الگ بات کرنا چاہتے تھے۔ غزل نے کمرے میں آتے ہی یہ سن لیا تھا کہ کمرے میں رشتے کی بات چل رہی ہے۔ وہ چائے رکھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کی امی نے چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھائی۔

وہ پیالی لیتے ہوئے بولے۔ "میں ایک رشتے کی بات کرنے آیا ہوں۔ آپ یہ رشتہ قبول کر لیں تو سارے درد دور ہو جائیں گے۔ بیٹی کا بوجھ اتر جائے گا اور آپ کو تمام مشکلات سے نجات بھی مل جائے گی۔"

غزل کمرے سے باہر آ کر رک گئی۔ تجسس پیدا ہوا' نہ جانے کیسا رشتہ لائے ہیں۔ اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ "بیٹی کا بوجھ اتر جائے تو سمجھیں سر سے پہاڑ اتر جائے گا۔ لڑکا کیسا ہے؟"

"لڑکا.........؟" ہمنوا کو چکر سا آ گیا۔ جب بھی کہیں رشتے کی بات چلتی ہے تو پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ لڑکا کیسا ہے؟ یہ نہیں پوچھا جاتا کہ بڈھا کیسا ہے؟

وہ جھجکتے ہوئے بولے۔ "لڑکے کی صورت شکل نہیں دیکھی جاتی اور نہ ہی عمر دیکھی جاتی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ کمائی کو دیکھا جاتا ہے۔ میں جن کی بات کر رہا ہوں' وہ صاحب کروڑوں کماتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ غزل کروڑوں میں کھیلے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولیں۔ "یااللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بھائی صاحب! وہ امیر کبیر ہیں۔ کیا ایسے غریب گھرانے میں رشتہ کریں گے؟"

"وہ تو رشتہ کرنے کے لئے ایک پاؤں پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے غزل کو دیکھا ہے۔ اور یہ عزم مصمم کیا ہے کہ وہ غزل کو یہاں سے دلہن بنا کر لے جائیں گے۔"

کمرے سے باہر کھڑی ہوئی غزل نے حیرانی سے سوچا۔ "ایسا کون امیر کبیر شخص ہے جو میرا دیوانہ ہو گیا ہے؟ اس نے مجھے دیکھا بھی ہے' لیکن کب دیکھا ہے؟ کہاں دیکھا ہے؟"

سکندر بیڈ کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ اس کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ان کی باتیں سنتے ہوئے کڑھ رہا تھا کہ غزل کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ اس کی چیز اس سے چھینی جا رہی ہے۔

اِدھر غزل کی امی خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں' کہہ رہی تھیں۔ "وہ کرم کرنے والا دیر کرتا ہے۔ اندھیر نہیں کرتا اور جب دیتا ہے چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ آپ لڑکے کے متعلق تو کچھ بتائیں۔"

پھر وہی لڑکا! ہمنوا صاحب نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ "میں عرض کر چکا ہوں کہ رشتہ آئے تو عمر کا حساب نہیں کرنا چاہئے۔ عمر جتنی زیادہ ہوتی ہے۔ کمائی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ عمر کچھ زیادہ ہے۔ تب ہی تو وہ اتنے دولت مند ہیں۔"

"اچھا......... سمجھ گئی۔ اپنی بیٹی کی خوش حالی دیکھنی چاہئے۔ عمر سے کیا لینا؟ آج کل کے جوان لڑکے کرتے کیا ہیں؟ روزگار نہ ملے تو چوری چکاری میں لگ جاتے ہیں۔ وہ آگے آگے بھاگتے ہیں۔ پولیس ان کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہے۔"

غزل زیر لب بڑبڑانے لگی۔ "امی تو سکندر کے پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔ یہ تو پوچھنا چاہئے کہ رشتہ کہاں سے آیا ہے؟"

دروازے کے پیچھے سکندر مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ بڈھا پہلے تو آنٹی کے سامنے ملازمت کا چارہ ڈال رہا تھا۔ اب غزل کو یہاں سے نکال کر کسی بڑے گھر میں پہنچانے کی بات کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اپنے جیسے ہی کسی بڈھے کا رشتہ لایا ہے۔ تب ہی اس قدر گھما پھرا کر بول رہا ہے۔

ہمنوا کہہ رہے تھے۔ "میں چاہتا ہوں۔ آپ ایک بار نواب سعد اللہ جان سے ملاقات کر لیں۔ ان سے مل کر آپ ان کے رکھ رکھاؤ اور میل ملاپ سے متاثر ہوں گی اور فوراً ہی رشتے کے لئے ہاں کر دیں گی۔"

غزل کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ لڑکیاں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ لیتی ہیں۔ اس نے پہلی ملاقات میں کسی حد تک نواب صاحب کو سمجھا تھا۔ انہوں نے بڑی اپنائیت سے گفتگو کی تھی۔ اپنے ہاں ملازمت کرنے پر زور دیا تھا پھر اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی تھی کہ اسے ان کی ذاتی کار میں گھر تک پہنچایا جائے۔ کسی حد تک انہیں سمجھ لینے کے باوجود یہ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اسے اپنی شریکِ حیات بنا لینا چاہیں گے۔

پہلے پسند کیا جاتا ہے پھر چاہت پیدا ہوتی ہے پھر وہ چاہت عشق کے درجے تک پہنچتی ہے۔ تب وہ عاشق چھونا چاہتا ہے۔ وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی۔ "یہ نواب صاحب کیسے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ نہ انگلی پکڑی' نہ پہونچے تک پہنچے۔ سیدھے سہاگ رات کے بند کمرے میں پہنچانے کی تیاری کر چکے ہیں۔"

اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ "اللہ نے چاہا تو غزل کے ابو ایک ہفتے میں اسپتال سے واپس آجائیں گے۔ میں چاہوں گی کہ ہم آپ کے ساتھ ہی نواب صاحب کے گھر جائیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ایسی ملاقاتیں ضروری ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا مشورہ دیں گے؟"

غزل بڑبڑانے کے انداز میں بولتے ہوئے کمرے میں آئی۔ "امی.......... گھڑی دیکھیں۔ آپ کو اسپتال جانا ہے۔"

"بیٹی! میں کیا بتاؤں؟ بھائی صاحب نے ایسی بات چھیڑی ہے کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

پھر وہ ہمنوا کو دیکھ کر بولی۔ "لیکن کیا کروں؟ وہ اسپتال میں اکیلے ہیں۔ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو پھر کسی دن آجائیں؟ ابھی تو مجھے اجازت دیں۔ آپ تشریف رکھیں۔ غزل سے بات چیت کریں۔ بیٹی! انہیں کچھ کھلائے پلائے بغیر نہ جانے دینا۔"

وہ غزل کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لیتے ہوئے کمرے سے باہر آئیں۔ خوشی کے مارے دبی دبی سرگوشی میں بولیں۔ "تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے۔ خدا تم پر مہربان ہے۔ نواب واجد علی شاہ نے تمہارا رشتہ.........."

انہیں غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے بولیں۔ "نہیں واجد علی شاہ نہیں.......... وہ.......... وہ.......... نواب سعد اللہ جان نے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"

"امی خدا کے لئے معاف کریں۔ ابھی میں آپ سے بحث نہیں کروں گی۔ وہاں ابو آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پلیز.......... آپ جائیں۔ رات کا کھانا باسکٹ میں رکھ دیا ہے۔ اسے لے جائیں۔"

وہ چادر اٹھا کر اوڑھتے ہوئے بولیں۔ "میں جانتی ہوں' بھائی صاحب سنیں گے تو کیا سوچیں گے؟ میں کل آؤں گی پھر تم سے بات کروں گی؟ بھائی صاحب کو کچھ کھلا پلا کر رخصت کرنا اور ان کے منہ پر رشتے سے انکار نہ کرنا۔"

وہ دھیمی آواز میں نصیحتیں کرتے ہوئے باسکٹ اٹھا کر گھر سے باہر چلی گئیں۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ سر گھما کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔ اگرچہ اپنا کمرا نظر نہیں آرہا تھا' لیکن تصور میں سکندر ایک قیدی کی حیثیت سے بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس کی حالت پر کڑھنے لگی۔ بے چارے صبح سے حبس بے جا میں تھے۔

وہ جلد سے جلد استاد ہمنوا کو رخصت کر دینا چاہتی تھی۔ تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ انہوں نے کہا۔ "آؤ.......... بیٹھو.......... دراصل تم سے بات کرنے آیا تھا۔ تمہارا رجحان معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے تمہاری امی سے بات ہوگئی۔"

وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا نواب صاحب نے آپ کو بھیجا ہے؟"

"ہاں پچھلے تین ماہ سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم نے بھی حد کر دی۔ فون پر تو

ان سے رابطہ کر سکتی تھیں۔"

وہ بولی۔ "ان سے ایک بار ملاقات ہوئی ہے۔ کوئی دیرینہ شناسائی نہیں ہے۔ میں ان سے فون پر کیا بات کرتی؟"

اس کی بے نیازی نے ہمنوا کو الجھا دیا۔ انہوں نے بات بنائی۔ "شناسائی پیدا کی جاتی ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں تم انہیں فون کر سکتی تھیں۔ ہاں یا ناں کا جواب دے سکتی تھیں۔"

سکندر کمرے سے باہر آگیا۔ آنٹی کے جانے کے بعد دل سے خوف نکل گیا تھا۔ وہ گھر میں دندناتی پھر رہی تھیں۔ کسی بھی کمرے میں آسکتی تھیں۔ ہمنوا سے اسے یہ اندیشہ نہیں تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کے قریب آکر سننے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں فی الحال ملازمت نہیں کر سکوں گی۔ آپ نہیں جانتے' میں طرح طرح کی ذہنی پریشانیوں میں گھری ہوئی ہوں۔"

وہ بولے۔ "میں نے تو یونہی ملازمت کی بات کی ہے تاکہ اس بہانے سے ان سے تمہارا رابطہ رہے۔ اب تو بات ملازمت سے آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ بات میں تمہاری امی سے کر چکا ہوں۔ وہ تو بہت خوش ہیں۔"

"پلیز آپ یہ بات رہنے دیں۔ میرا ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ آپ کوئی دوسری بات کریں۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو! تم اور تمہارے والدین نہ جانے کیسے کیسے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسے میں تم بہترین ملازمت ٹھکرا رہی ہو۔ شادی کے بعد تمہارا مستقبل اتنا شاندار ہو گا کہ خود تمہیں اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آئے گا۔ تمہارے والدین کا بڑھاپا آرام سے گزرے گا اور تم ہو کہ شادی سے انکار کر رہی ہو۔"

"میں آپ کی ایسی باتوں کا جواب نہیں دے سکوں گی۔ میری مجبوریاں کیا ہیں؟ میں بتا نہیں سکوں گی۔"

"مجھ ناسمجھ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ جب سارے مسائل حل ہو رہے ہیں تو مجبوریاں کہاں سے پیدا ہوں گی؟ اگر تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ ہے تو یہ اچھی

طرح سمجھ لو کہ وہ رکاوٹ تمہاری نیک نامی اور تمہاری خوش حالی نہیں چاہتی۔ میں تم سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ تم اپنی اور اپنے والدین کی نیک نامی اور خوش حالی کیوں نہیں چاہتی ہو؟ یا تو میرے سوال کا جواب دو یا پھر اپنی مجبوری بتاؤ۔"

اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا پھر کہا۔ "آپ نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ میں آپ کے تجربات کے سامنے ابھی بچی ہوں۔ آپ سے بحث نہیں کر سکتی۔"

"تم باتیں بنا رہی ہو۔ جواب نہیں دے رہی ہو۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے؟ وہ نواب سعداللہ جان کو کبھی اپنا آئیڈیل بنا ہی نہیں سکتی تھی۔ ان کے ساتھ پوری زندگی گزارنا تو دور کی بات رہی۔ ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتی تھی' لیکن جب زندگی قدم قدم پر چیلنج کر رہی ہو' مسائل نوچ کھسوٹ رہے ہوں تو ایسے وقت اپنی پسند ناپسند اور اپنے دلی جذبات نہیں دیکھے جاتے۔ اپنے جذبوں اور ارمانوں کے خلاف ایسے مسیحا کو قبول کرنا پڑتا ہے جو اپنی دولت سے بیمار زندگی کی مسیحائی کرتا ہے۔ سارے درد دور کر دیتا ہے۔

غزل کو بھی یہی کرنا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اپنے والدین کے بڑھاپے سے دشمنی کرتی۔ اپنے باپ کو خیراتی اسپتال میں رکھے گی۔ ماں کو بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ دے گی اور خود ایک نااہل اور ناکارہ عاشق کے پیچھے ذلیل و خوار ہوتی رہے گی۔

وہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ بوڑھے والدین کو حرام کی کمائی نہ کھلائے۔ دل دھڑک دھڑک کر باؤلا ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ سکندر ہی اس کا اوّل ہے اور وہی اس کا آخر ہے۔

ہمنوا نے کہا۔ "پتا نہیں تم کس کشمکش میں مبتلا ہو؟ خدا جانتا ہے کہ کون سی مجبوریاں تمہیں عقل و فہم سے دور لے جا رہی ہیں؟ میں ایک بزرگ کی حیثیت سے تمہیں صرف نصیحت کر سکتا ہوں۔ اپنے آپ سے پیار کرو۔ اپنی زندگی کو اہمیت دو۔ اسے تخریب سے روکو اور تعمیر کی طرف لے جاؤ۔ بلندیوں کو چھونے اور والدین کو آرام اور سکون پہنچانے کے لئے اپنے منفی جذبوں سے جنگ کرو' جو شیطانی قوتیں تمہیں بہترین زندگی کی طرف جانے سے روک رہی ہیں۔ ان قوتوں کو اپنی ذہانت سے کچل دو۔"

سکندر مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ دانت پیس رہا تھا۔ وہاں سے چھلانگ لگا کر ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ہمنوا کی گردن دبوچ لینا چاہتا تھا' لیکن عقل سمجھا رہی تھی' کوئی ہنگامہ ہو گا تو وہاں سارا محلہ اکٹھا ہو جائے گا۔ سب غزل سے پوچھیں گے کہ تمہارے گھر میں جوان مرد کہاں سے آیا ہے؟ پھر دونوں کو بدکاری کے الزام میں تھانے پہنچایا جائے گا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پا رہا تھا۔

ہمنوا صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں چلتا ہوں۔ تم سے امید کرتا ہوں کہ تم عقل سے سوچو گی اور سمجھو گی۔"

وہ دروازے تک ان کے ساتھ آئی۔ دروازہ کھولنے لگی۔ انہوں نے کہا۔ "کبھی کبھی اپنی غلط خواہشات کے خلاف اور غلط فیصلوں کے خلاف اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہیں خود سے لڑنا آ جائے۔"

وہ سر جھکا کر خاموش کھڑی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "تم نے ایک شاگرد کی حیثیت سے کبھی اپنے استاد کو کوئی نذرانہ پیش نہیں کیا۔ آج میں کچھ مانگ رہا ہوں۔ زبان خالی تو نہیں جائے گی؟"

غزل نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "آپ شرمندہ نہ کریں۔ میرے اختیار میں جو ہو گا وہ نذرانے کے طور پر پیش کروں گی۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"صرف ایک گزارش ہے۔ نواب صاحب کی پیش کش پر ذہانت سے غور کرو۔ کل شام کو چھ بجے ان سے فون پر ضرور بات کرنا۔ مصلحت کا تقاضا ہے کہ سب کو خوش رکھو۔ ہم جسے آج کھوٹا سکہ سمجھتے ہیں۔ کل وہی ہمارے لئے سکہ رائج الوقت بن جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی سکندر غصے سے پاؤں پٹختا ہوا آیا پھر گرج کر بولا۔ "وہ بوڑھا کیا بکواس کر رہا تھا؟"

"آپ ادب اور احترام سے بولیں۔ وہ ہمارے بزرگ ہیں۔"

"بزرگ دلالی نہیں کرتے۔ وہ دلالی کر رہے ہیں۔ تمہیں مجھ سے چھین کر کسی بڑے آدمی کے پاس پہنچا رہے ہیں۔"

"آپ کیسی شرمناک باتیں کر رہے ہیں؟ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ ان کے لئے نازیبا الفاظ نہ استعمال کریں۔ کسی کے گھر آ کر رشتہ مانگنا دلالی نہیں ہے۔ ایسا ہر گھر میں ہوتا

ہے۔ آپ کو غصہ کیوں آ رہا ہے؟"

"وہ کسی بوڑھے دولت مند کا رشتہ لے کر آیا تھا۔ آنٹی تو فوراً ہی راضی ہو گئیں۔ انکل بھی راضی ہو جائیں گے۔ خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ تم ان کے سامنے بالکل خاموش تھیں۔ تم جانتی تھیں کہ میں سن رہا ہوں۔ اس لئے ہاں یا ناں میں جواب نہیں دے رہی تھیں۔ تم بہت چالاک ہو۔ اُدھر مجھے مطمئن کر رہی تھیں۔ اِدھر یہ تاثر دے رہی تھیں کہ شادی کے لئے راضی ہو سکتی ہو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "ہاں میں مکار ہوں۔ آپ کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ میری خاموشی آپ کو یہی سمجھا رہی تھی۔ یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں نہیں آئی کہ میں اپنے استاد محترم کے سامنے آپ کا نام فخر سے نہیں لے سکتی تھی۔ آپ کی محبت کا دم نہیں بھر سکتی تھی۔ کیا آپ کا کردار ایسا ہے کہ آپ کو کسی شریف آدمی سے برتر کہا جا سکے؟"

"آج ایک بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے تو مجھے کمتر سمجھ رہی ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ دولت کو دیکھ کر نیت بدل رہی ہے؟"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ "ہاں۔ میں بدنیت ہوں۔ آپ کو چھوڑ کر ایک بوڑھے دولت مند سے شادی کرنے والی ہوں۔ آپ کیا کریں گے؟ مجھے جان سے مار ڈالیں گے؟"

تڑاخ کی آواز کے ساتھ ایک زور دار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلی گئی۔ ایسا زبردست ہاتھ تھا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ دوسرا طمانچہ دوسرے گال پر پڑا۔ اس نے بچپن میں شاید ماں باپ کی مار کھائی ہو گی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔ وہ بدحواس سی ہو گئی۔

اس نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "تم مجھے چھوڑ کر اس بڈھے کے پاس چلی جاؤ گی؟ کیا اتنی جلدی مجھ سے دل بھر گیا ہے؟ تمہاری زبان پر کسی دوسرے کا نام بھی آیا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔"

اس نے پھر اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ وہ ایک دم سے جونک کی طرح اس سے چمٹ گئی۔ اس کے سینے پر اپنے چہرے کو رگڑنے لگی۔ اِدھر اُدھر سے چومنے لگی۔

رونے لگی' سسک سسک کر قربان ہونے لگی۔

وہ تھم گیا۔ اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ وہ مار کھانے کے باوجود پیار کی شدت سے لپٹ رہی تھی۔ اس کے اندر گھس جانا چاہتی تھی۔ اس کی باؤلی ادائیں کہہ رہی تھیں' تُو ہی دشمن ہے' تُو ہی دوست ہے' تُو ہی ظالم ہے' تُو ہی مہربان ہے' تو مارے تو مر جاؤں' تُو سحر پھونکے تو جی اٹھوں' تُو توڑ دے مروڑ دے' بکھیر دے پھر سمیٹ لے تو تیرے دل کی دھڑکن بن جاؤں۔

وہ اسے چوم کر بازوؤں میں اٹھا کر کمرے میں آگیا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے میں بدل رہے تھے۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ان میں سے کسی کو لائٹ آن کرنے کی فرصت نہیں تھی۔

تاریکی کہہ رہی تھی۔ "میں کیا کروں؟ دوراہے پر آگئی ہوں۔ کدھر جاؤں؟ عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

اندھیرا کہہ رہا تھا۔ "محبت عقل سے نہیں' دل سے ہوتی ہے اور تمہارا دل صرف میرے لئے دھڑکتا ہے۔ تم کسی دوسرے کی طرف بھٹکنے نہ جاؤ۔"

عقل کہہ رہی تھی۔ "زندگی کو مہذب انداز میں گزارو' دہشت گردی اور جرائم کی حوصلہ افزائی نہ کرو۔ اسے گلے لگاؤ گی تو تہذیب خاک میں ملے گی۔"

دل کہہ رہا تھا۔ "میرے آگے کسی کا زور نہیں چلتا' جذبات کے سیلاب میں عقل بہہ جاتی ہے۔ ان لمحات میں جذبوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ اس میلے میں کھو جاؤ پھر خود کو نہ پاؤ۔"

وہ کھو گئی۔ وقت کیسے گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔ رات کے تین بجے سکندر نے خود کو تہذیب سے آشنا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے جانا چاہئے۔ میں کل سے یہاں قیدی بنا ہوا ہوں۔ ابھی اندھیرا ہے۔ چپ چاپ نکل جاؤں گا۔"

وہ اداس ہو گئی۔ اس کے پیچھے آکر اس سے لگ گئی۔ اس کا بدن کہہ رہا تھا۔ "مجھے بھولو گے تو نہیں؟ تم نے مجھ سے دور تک شناسائی حاصل کی ہے۔ اب دور کیوں جا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "یہ تاریکی بڑی راز دار ہے۔ میں تاریکی میں جا رہا ہوں۔ کل رات کسی

وقت ایسی ہی تاریکی میں آؤں گا۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر صحن سے گزر کر دروازے پر آئے۔ دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ غزل نے دروازے کو بڑی راز داری سے ذرا سا کھولا' گلی سنسان نظر آئی۔ اس نے اور ذرا سا کھول کر دائیں بائیں دور تک دیکھا پھر سرگوشی میں کہا۔ "کوئی نہیں ہے۔"

سکندر نے اسے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ وہ تڑپ کر گرفت سے نکل گئی۔ "کیا کرتے ہیں؟ کوئی دیکھ لے گا؟"

اس نے باہر آکر دیکھا' گلی میں بھونکنے والا ایک کتا بھی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسری گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ دروازے کو بند کر کے پھر اسی کمرے میں آگئی۔ ایک کمرا ذرا پہلے کتنا آباد تھا۔ وہ کمرا اس کے جاتے ہی بیوہ کی طرح اجڑ گیا تھا۔ وہ بیڈ پر آکر یوں اوندھے منہ گر پڑی جیسے جانے والے سے لپٹ رہی ہو۔ جانے کے بعد بھی اس سے الگ نہیں ہو رہی ہو۔ کیا ستم ہے کہ جانے والے خالی بستر چھوڑ جاتے ہیں۔

وہ سوچنے لگی۔ "کیا وہ اسی طرح چھپ کر آتے رہیں گے' جاتے رہیں گے؟ یہ جذباتی کھیل بھی اچھا لگ رہا ہے اور میں اس حقیقت سے جان بوجھ کر کترا رہی ہوں کہ یہ سراسر بے حیائی ہے۔ امی ابو سکندر کو کبھی داماد نہیں بنائیں گے۔ ساری دنیا کہے گی میری پسند گھٹیا ہے۔ میں تعلیم یافتہ ہو کر عزت و غیرت اور عمدہ معیار کو نہیں سمجھ رہی ہوں۔"

وہ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی۔ اب دوسری رات کی صبح ہونے والی تھی۔ سوچتے سوچتے آنکھیں بند ہو گئیں۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ گہری نیند نہیں آئی کچی نیند کے دوران بھی کبھی سوتی رہی' کبھی جاگتی رہی۔ کبھی سکندر' کبھی امی ابو اور کبھی ہمنوا یاد آتے رہے۔

نیم خوابی کی حالت میں ہمنوا کی باتیں اس کے اندر گونجتی رہیں۔ "کبھی کبھی اپنی غلط خواہشات کے خلاف اور غلط فیصلوں کے خلاف اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہیں خود سے لڑنا آجائے۔"

وہ بے چینی سے کروٹ بدل کر سوچنے لگی۔ پتا نہیں سونے لگی یا جاگنے لگی؟ اونگھنے لگی یا اپنے حالات کو سونگھنے لگی' جلنے کی بو آرہی تھی۔ وہ غلط ہانڈی میں پک رہی تھی۔ پکانے والا آتا تھا' اسے چولھے پر چڑھا کر چلا جاتا تھا۔ ایسے میں ہانڈی ضرور جلتی ہے۔

نیند میں بے چینی تھی۔ وہ دھیمی آواز ذہن کے سناٹے میں گونجنے لگی۔ ”صرف ایک گزارش ہے۔ نواب صاحب کی پیش کش پر ذہانت سے غور کرو۔ کل شام چھ بجے ان سے فون پر ضرور بات کرنا۔ مصلحت کا تقاضا ہے کہ ان کی دل شکنی نہ کرو۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ سب کو خوش رکھو۔ ہم آج جسے کھوٹا سکہ سمجھتے ہیں۔ کل وہی ہمارے لئے سکہ رائج الوقت بن جاتا ہے۔“

اسے اپنے بدترین حالات کے مطابق استاد ہمنوا کی باتوں کو فوراً تسلیم کرلینا چاہئے تھا۔ دانش مندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ عزت و آبرو سے اپنے مستقبل کو بہترین بنایا جائے اور ماں باپ کو بڑھاپے میں آرام پہنچایا جائے۔

کسی عمر رسیدہ شخص کو جیون ساتھی بنایا جائے یا نہیں' اس کا فیصلہ اپنے مزاج کے مطابق بھی کیا جاسکتا تھا اور اپنے بدترین حالات کو شکست دینے کے لئے بھی کیا جاسکتا تھا۔ سکندر کے ساتھ ذلت و خواری اور بدنامی کے پیشِ نظر ایک بوڑھے کے ساتھ نیک نامی بہتر ہے۔ یہ بات وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھی۔ اب نیم خوابی کی حالت میں بھی یہی باتیں اس کا ذہن اسے سمجھا رہا تھا۔

صبح نو بجے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ چھت کی طرف تکنے لگی اور سوچنے لگی' میں سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی یا خواب دیکھ رہی تھی؟ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گھڑی میں وقت دیکھا نو بج چکے تھے۔ اس کے ابو کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اسے اسپتال جانا چاہئے تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی' الماری سے کپڑے نکال کر غسل خانے میں چلی گئی۔

اس وقت اس کے نزدیک تمام جذبات امی اور ابو کے لئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی' ابو کو آپریشن کے لئے لے جایا گیا ہو گا۔ امی تنہا پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ایسے وقت اسے امی کے پاس رہنا چاہئے۔

اس نے غسل سے فارغ ہوتے ہی گیلے بالوں کو کسی حد تک خشک کیا۔ گھر میں ناشتے

کے لئے کچھ نہیں تھا۔ چائے تیار کر کے پینے میں دیر ہو جاتی۔ اس نے سوچا اسپتال کی کنٹین میں چائے پی لے گی۔ اس نے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ باہر والے دروازے پر تالا لگایا پھر بس میں بیٹھ کر اسپتال کے لئے روانہ ہوگئی۔

آپریشن تھیٹر کے سامنے کوریڈور میں عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہاں ایک ہی دن میں کئی مریضوں کے آپریشن بھگتائے جاتے تھے۔ ان کے لواحقین آپریشن کے نتائج معلوم کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ وہاں بیٹھنے کے لئے ایک بنچ اور چند کرسیاں تھیں۔ افراد اتنے زیادہ تھے کہ وہاں بیٹھنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ان میں سے کئی افراد کھڑے ہوئے تھے اور کئی فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی امی فرش پر سر جھکائے گہری سوچوں میں گم تھیں۔ اگرچہ آپریشن معمولی تھا لیکن وہ طرح طرح کے وسوسوں اور اندیشوں میں گھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے بیٹے کو فون پر اطلاع دی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ بیٹی کو معلوم تھا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہیں۔

جب اپنے سگے موجود ہوں اور مصیبت کی گھڑیوں میں ساتھ نہ ہوں تو پہلے دل روتا ہے پھر آنکھ رونے لگتی ہے۔ ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ انہوں نے آنچل آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ غیروں کو اپنے آنسو دکھانا نہیں چاہتی تھیں۔ اپنوں کے سامنے رونے سے دل ہلکا ہوتا ہے۔ اپنے کسی کام آئیں یا نہ آئیں' آنسو تو پونچھ دیتے ہیں۔

انہوں نے آنکھوں سے دوپٹہ ہٹایا۔ بیٹی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی پھر محبت سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”کیا ابو کو اندر لے گئے ہیں۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں......... آج چھ آپریشن ہیں۔ پتا نہیں ان کی باری کب آئے گی؟“

”جب اندر لے گئے ہیں تو آج آپریشن ضرور ہو جائے گا۔“

وہ بولیں۔ ”آج تمہیں جلدی آنا چاہئے تھا۔ اتنی دیر کیوں لگا دی؟ نثار ابھی تک نہیں آیا ہے۔ میری دو ہی اولادیں ہیں۔ تم ہو اور وہ ہے۔ بیٹے کا سہارا نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے آس لگائے رہتی ہوں۔ ایک تمہارا سہارا رہ گیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تم ہم سے چھینی جا رہی ہو۔ بدقسمتی سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ اگر مقدر نے تمہیں دور ہونے پر

مجبور کر دیا تو ہم دو بوڑھے کہاں جائیں گے۔"

انہوں نے پھر آنچل کو آنکھوں پر رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس نے مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کس سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے کے لئے اپنے پیدا کرنے والوں سے رشتہ کمزور کر رہی ہے۔ وہ بوڑھوں کا آخری سہارا تھی۔ اس آخری سہارے کو بھی چھین رہی تھی۔

اس نے پھر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ تو پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں۔ میں بھائی جان کی طرح بے حس نہیں ہوں کہ آپ کو اور ابو کو بے سہارا چھوڑ دوں گی۔"

وہ اپنے شانے پر سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی! میں تو تمہارے تین ہزار لے کر پچھتا رہی ہوں۔ تمہارے باپ کی سلامتی کے لئے یہ حرام کمائی میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی ہوں۔ دعا مانگ رہی ہوں کہ آپریشن کے بعد ڈاکٹر مہنگی دوائیں نہ لکھ دیں' پھر میں یہ رقم تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ اس کے بعد بھوکی مر جاؤں گی لیکن ایسی کمائی تمہیں گھر میں نہیں لانے دوں گی۔ پتا نہیں اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے؟ وہ مفلسی اور محتاجی بھی دے رہا اور بے غیرت بننے پر بھی مجبور کر رہا ہے۔"

"امی! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔"

"تم مجھے بولنے سے روک رہی ہو۔ کیا دنیا والوں کی زبانیں بند کر سکو گی؟ تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ ماں کی نصیحتیں بے اثر ہو رہی ہیں۔ باپ آنسو بہائے گا تو اس کے آنسو بھی تمہیں نہیں پگھلائیں گے۔"

"امی! آپ نہیں جانتیں میں دوراہے پر کھڑی ہوں۔ آپ میری ایک بات مان لیں۔ سکندر دل کے برے نہیں ہیں۔ وہ غلط راستے پر چل پڑے ہیں۔ میں انہیں سیدھے راستے پر لے آؤں گی۔"

"اور جب تک وہ سیدھے راستے پر نہیں چلے گا' تم ہمیں حرام کی کمائی کھلاتی رہو گی۔"

وہ چپ رہی۔ انہیں قائل کرنے والا کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔ وارڈ بوائے کی آواز سنائی دی۔ "بیڈ نمبر بائیس والے آجائیں مریض کا آپریشن ہو چکا ہے۔"

وہ دونوں فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تیزی سے چلتے ہوئے جا رہی تھیں۔ اس کے ابو آنکھیں بند کئے لیٹے ہوئے تھے۔

انہیں دیکھتے ہی غزل کا دل محبت سے بھر آیا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وارڈ بوائے نے اس کی امی سے پوچھا۔ "یہ اسٹریچر کون لے جائے گا؟ تمہارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے؟"

اس کی امی نے کہا۔ "میرا بیٹا آنے والا تھا؟"

غزل نے کہا۔ "مگر بیٹے.......... ایسے وقت مجبور ہوتے ہیں۔ بے چارے آنہیں پاتے۔"

ماں نے اسے گھور کر دیکھا' پھر فوراً ہی وارڈ بوائے سے کہا۔ "بھائی! وہ اچانک بیمار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں دس روپے دوں گی۔ اس کے ابو کو لے چلو۔"

وارڈ بوائے اسٹریچر کو لفٹ میں لے آیا پھر سیکنڈ فلور پر اس کے ابو کو بیڈ پر پہنچا دیا۔ ان کی بے ہوشی دیر پا نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آنے لگے پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سب سے پہلے بیٹی نظر آئی۔ وہ بڑے پیار سے مسکرانے لگے۔ وہ تڑپ کر ان کے قریب آئی۔ ان پر جھک کر پیشانی کو چوم لیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ اس کی امی ان کے ایک ہاتھ کو پیار سے تھپتھپا رہی تھیں۔ اتنے مصائب کے باوجود وہ ان لمحات میں ایک دوسرے کی محبتوں سے سرشار ہو رہے تھے۔

وہ بولنے کے قابل نہیں تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے کاغذ اور قلم مانگا۔ وہ کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ ایسے ہی وقت بیٹا آگیا۔ ماں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "آؤ بیٹے! یہاں آکر بڑا احسان کر رہے ہو۔"

بیٹے نے کہا۔ "امی! آپ طعنہ دینے سے پہلے یہ تو پوچھ لیں کہ مجھے دیر کیوں ہوئی ہے؟ میں ابو کے لئے کچھ رقم کا انتظام کر رہا تھا۔ پچھلے دو دنوں سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ دو ہزار روپے مل گئے۔"

اس نے جیب سے دو ہزار نکال کر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے بیٹے کو گلے سے لگا کر پیار کیا پھر کہا۔ "میں جانتی تھی' ہمارا بیٹا ہمیں نہیں بھولے گا۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے یہ دو ہزار ہمارے کتنے کام آئیں گے۔"

بیٹے نے باپ کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ کا آپریشن ہو چکا

ہے۔ یہ ننھا سا آلہ لگا دیا گیا ہے۔ اب آپ کو سانس کی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ تو جانتے ہیں ایک محدود تنخواہ میں آپ کی بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ گزارہ کر رہا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے کہ میں آپ لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔"

ماں نے کہا۔ "بس کرو۔ زیادہ نہ بولو۔ ہم تمہاری مجبوریاں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم ہمارے پوتے پوتیوں کو حلال کی کمائی کھلا رہے ہو۔ انہیں اچھے سکول میں پڑھا رہے ہو۔ یہی ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔"

اس کے ابو نے کاغذ پر لکھا۔ "تم یہ دو ہزار کہاں سے لائے ہو؟"

بیٹے نے اسے پڑھ کر جواب دیا۔ "چھ برس پہلے آپ خوب کماتے تھے۔ ہم بڑی اچھی زندگی گزارتے رہے تھے۔ ان دنوں میں نے آپ سے پانچ ہزار لے کر ایک دوست کو ادھار دیئے تھے۔ آج پورے چھ برس کے بعد وہ پانچ ہزار واپس نہ کر سکا۔ بڑی شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے یہ دو ہزار روپے دیئے ہیں۔ یہ آپ کی رقم ہے۔ آپ ہی کے کام آ رہی ہے۔"

ماں نے کہا۔ "ایسی ضرورت کے وقت دو ہزار وصول ہو گئے یہی بہت ہے۔ بچوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لے جاؤ۔ اس رقم سے پانچ سو لے لو۔"

"نہیں امی! یہاں دواؤں کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔"

اسی وقت موبائل فون کے بزر کی آواز سنائی دی۔ نثار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اوپری جیب سے ننھا سا موبائل فون نکالا۔ اس فون کے ساتھ ہی ہزار ہزار کے تین نوٹ نکل کر باپ کے پاس بیڈ پر گر پڑے۔ وہ فون اٹینڈ کرنا بھول گیا۔ پریشان ہو کر کبھی ان نوٹوں کو اور کبھی اپنے ماں باپ کو دیکھنے لگا۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر ہچکچا رہا تھا۔

غزل نے ہزار ہزار کے تین نوٹوں کو اٹھایا۔ ماں باپ اپنے فرمانبردار بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ غزل نے وہ نوٹ بھائی کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں بھائی جان! آپ نے ابو کے پانچ ہزار وصول نہیں کئے ہیں۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ فوراً ہی پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا اس وارڈ سے باہر چلا گیا۔ بچھو اور بیٹے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بچھو پیدا ہونے سے پہلے ماں کو پیٹ کے اندر ہی اندر کھرچتا رہتا ہے۔ جب پیٹ میں سوراخ ہو جاتا ہے تو باہر نکل آتا ہے۔ ماں کو مار کر

زندگی حاصل کرتا ہے۔ انسان کے بچے ایسا نہیں کرتے وہ پیدا ہونے کے بعد ماؤں کے دلوں میں سوراخ کرتے ہیں۔

اس کی امی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اس کے ابو کاغذ پر لکھنے لگے۔ "بیٹی غزل! تم خوش نصیب ہو کہ بیٹا نہیں ہو۔ کیا تم صحیح معنوں میں بیٹی ہونے کا ثبوت دو گی؟ تمہاری امی نے پچھلی رات تمہارے حالات بتائے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب سعد اللہ جان نے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ میں چاہوں گا کہ تم ایک عزت دار باپ کی عزت دار بیٹی کی طرح اپنے مستقبل کا فیصلہ کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں دو ہزار روپے مل چکے ہیں۔ تم سکندر کو وہ تین ہزار واپس کر دو۔ باپ کی جان' میرا سر نہ جھکاؤ۔"

انہوں نے وہ کاغذ غزل کی طرف بڑھایا۔ اس نے اسے لے کر پڑھا تو سر جھک گیا۔ وہ باپ سے نظریں ملا نہ سکی۔ ماں نے اس کی تحریر کو پڑھ کر تین ہزار روپے نکالے پھر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اس پاک پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ وہ ہمیں بے غیرتی سے باز رکھ رہا ہے۔ میں تمہارے ابو کی قسم کھا کر کہتی ہوں آئندہ ایسی کمائی سے میرے گھر کا چولہا نہیں جلے گا۔"

باپ کی تحریر نے پہلے ہی سر جھکا دیا تھا۔ ماں کی غیرت مندی نے اسے اور شرمسار کیا۔ وہ منہ پھیر کر باپ کے پائنتی بیٹھ گئی پھر جب تک وہاں بیٹھی رہی۔ کچھ بول نہ سکی۔ ماں نے کہا۔ "آج آپریشن ہوا ہے۔ میں تمہارے ابو کو یہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکوں گی۔ میں کینٹین سے سالن اور روٹیاں لے کر آتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر چلی جاؤ۔"

وہ روٹی لانے چلی گئیں۔ غزل باپ کے پیروں کے پاس منہ پھیر کر بیٹھی ہوئی تھی۔ باپ نے ایک پیر سے اشارہ کیا۔ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ وہ ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔ اس نے کاغذ کو لے کر پڑھا' لکھا ہوا تھا۔ "منہ چھپانے کا کوئی کام کرو تو یہ ضرور یاد رکھو تمہارے ساتھ ماں باپ کو بھی منہ چھپانا ہو گا۔ ہم ایسے مقام پر ہیں جہاں عزت ملے گی تو بیٹی سے........... ذلت ملے گی تو بیٹی سے..........."

یہ پڑھتے ہی اس نے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایک ہاتھ سے اس کا سر سہلا رہے تھے۔ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کی شخصیت

کہہ رہی تھی۔ "جب باپ کا ہاتھ سایہ کرے تو بیٹی کو سر ننگا نہیں کرنا چاہیے۔"

دوپہر ہوئی تو اس نے ماں کے ساتھ روٹی کھالی۔ جب تک امی ابو کے ساتھ رہی' ان سے نظریں چراتی رہی۔ سر جھکا رہا' شکست خوردہ آواز میں بولتی رہی۔ پھر ان سے رخصت ہو کر اسپتال سے باہر آئی۔ اس کے ذہن پر ایسا بوجھ تھا جسے وہی اتار سکتی تھی۔ وہ فیصلہ کر رہی تھی کہ اب اس بوجھ کو مزید برداشت نہیں کرے گی' اسے اتار پھینکے گی۔

وہ بس میں آکر بیٹھ گئی۔ اس سفر کی منزل اسے معلوم تھی لیکن زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی۔ وہ اس راستے سے ناواقف تھی۔ کہاں کیسا موڑ آنے والا ہے؟ اس سے بے خبر تھی۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے دل و دماغ میں صرف بوڑھے والدین کی خوش حالی اور نیک نامی کی تحریک پیدا ہو رہی تھی۔

دل میں سکندر کی محبت مچلتی تو استادِ محترم کی نصیحت کانوں میں گونجنے لگتی۔ "کبھی کبھی اپنی غلط خواہشات کے خلاف اور غلط فیصلوں کے خلاف اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہیں خود سے لڑنا آجائے۔"

بس اچانک ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ خیالوں سے نکل آئی۔ سڑک پر ٹریفک جام ہو گیا۔ ڈرائیور بمشکل راستہ بنا کر بس کو سروس روڈ پر لے آیا۔ گاڑی پھر آگے بڑھنے لگی۔

زندگی کی گاڑی بھی ایسے ہی جھٹکوں سے رکتی ہے۔ اپنی حکمتِ عملی سے آگے بڑھانے کا راستہ بنانا پڑتا ہے تاکہ سفر کا سلسلہ جاری رہے۔ اسے بھی دانش مندی سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔

ایک بار پھر اس کے کانوں میں استاد محترم کے راہ نما الفاظ گونجنے لگے۔ "صرف ایک گزارش ہے۔ نواب صاحب کی پیش کش پر ذہانت سے غور کرو۔ کل شام کو چھ بجے ان سے فون پر ضرور بات کرنا۔ مصلحت کا تقاضا ہے کہ ان کی دل شکنی نہ کرو۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ سب کو خوش رکھو۔"

وہ سب کو خوش رکھنا چاہتی تھی۔ خود غرض کہلانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لئے خود سر جذبوں کا گلا گھونٹنا ضروری تھا۔ حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس نے شام چھ بجے نواب سعداللہ جان سے فوراً رابطہ کرنے کا ارادہ کیا تو ذہن میں سوال ابھرا کہ ان سے کیا

بولے گی؟ صرف ملازمت کا معاملہ ہوتا تو وہ بے جھجک باتیں کرلیتی۔ وہ تو اس کے طلبگار بنے ہوئے تھے۔ بات شادی اور رشتے داری تک پہنچ رہی تھی۔ وہ فون پر اسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہیں گے۔ ایسے میں وہ کیا جواب دے گی؟

وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہی تھی کہ آئندہ کیسی زندگی گزارے گی؟ جب کہ فیصلہ مشکل نہیں تھا۔ اس میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہو رہی تھی کہ دودھ کو دودھ تسلیم کرے اور پانی کو پانی سمجھ کر الگ کردے۔

بس پھر ایک بار رک گئی۔ وہ بس اس کی زندگی کی طرح تھی۔ اسے بھی حالات روک رہے تھے لیکن وہ راستہ بدل کر جا رہی تھی۔ اُدھر فائرنگ ہو رہی تھی۔ لوگوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ آگے خطرہ تھا۔ ڈرائیور گاڑی گھما کر مین روڈ سے ہٹا کر ایک گلی کی طرف لے جانے لگا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ دو چار جوان چھپ کر پولیس والوں کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ کچھ بھاگ رہے تھے کچھ گولیاں کھا کر گر رہے تھے۔ وہ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی۔ "یہ کون لوگ ہیں؟ کیوں شہر کا امن و امان برباد کر رہے ہیں؟"

بس کو راستہ ملتے ہی وہ تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ایسے ہی وقت غزل کا دل دھک سے رہ گیا۔ سکندر ہاتھوں میں گن لئے ایک طرف دوڑتا جا رہا تھا۔ تڑا تڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ غزل کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی تھی۔ وہ کھڑکی کے راڈ کو ایسے سختی سے پکڑے ہوئے تھی جیسے سکندر کو مضبوطی سے جکڑ کر موت سے بچا رہی ہو۔"

وہ چیخ چیخ کر اسے آواز دینا چاہتی تھی لیکن عقل پوچھ رہی تھی کہ وہ کس رشتے سے آواز دے گی؟ پھر بس کی مسافر عورتیں اور مرد اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھیں گے کہ وہ ایک دہشت گرد کی رشتے دار ہے۔ زندگی میں ایسے اہم مواقع آتے ہیں کہ جب دنیا والوں کے سامنے سر جھک جاتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ جو ذلت کے راستے پر جا رہا ہے۔ اس سے ہمارا کوئی واسطہ ہے۔

بس بہت آگے نکل آئی تھی پھر بھی وہ دوڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہونے والا تھا۔ اسی وقت وہ تڑا تڑ فائرنگ کی آواز کے ساتھ یکبارگی اچھلا پھر زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ غزل کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ "روکو.........

گاڑی روکو.........."

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ وہ کنڈیکٹر کی آستین کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "گاڑی روکو۔ مجھے اترنے دو۔ میں کہتی ہوں گاڑی روکو.......... گاڑی روکو۔"

کنڈیکٹر نے گاڑی کی باڈی پر ہاتھ مار کر روکنے کے لئے کہا۔ گاڑی آگے جا کر رک گئی۔ وہ عورتوں کو اِدھر اُدھر دھکیلتی ہوئی بس سے اتر گئی۔ اُدھر پلٹ کر جانے لگی جدھر سکندر نظر آیا تھا۔ وہ اور دوسرے گولیاں چلانے والے اور بھاگنے والے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بس نے اسے بہت دور لا کر چھوڑا تھا۔

وہ تیزی سے اس طرف بڑھنے لگی۔ اسے وہ جگہ یاد تھی وہ ایک کچرا گھر کے سامنے گولی کھا کر گرا تھا۔ کچرے جیسی زندگی گزارنے والا آخری دم کچرے ہی میں گرا تھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے اسے روکا۔ "واپس آجاؤ.......... اُدھر گولیاں چل رہی ہیں۔"

وہ بولی۔ "مجھے معلوم ہے۔ وہاں میرے ایک کزن کو گولی لگی ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔ مجھے جانے دو۔"

وہ زبردستی آگے بڑھتی چلی گئی۔ آگے سناٹا چھا گیا تھا۔ فائرنگ کرنے والے اور بھاگنے والے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سکندر کچرا گھر کے سامنے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک دکان دار سے پوچھا۔ "چاچا میاں! یہاں ایک جوان کو گولی لگی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ وہ اِدھر گولی کھا کر گرا تھا۔"

"ہاں۔ اِدھر گرا تو تھا پھر اس کے ساتھی اس کو اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"وہ کس طرف گئے ہیں؟"

"وہ اس برابر والی گلی میں۔"

وہ دوڑنے کے انداز میں تیزی سے چلتے ہوئے اس گلی میں آئی۔ وہاں سناٹا تھا۔ تمام مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ کوئی اسے بتانے والا نہیں تھا کہ سکندر کہاں ہے؟ اور اسے کہاں لے جایا گیا ہے؟

پھر اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ گولی کھانے کے بعد وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اس

نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کسی نے نہیں کھولا اور اندر سے پوچھا گیا۔ "کون ہے؟"

وہ بولی۔ "بھائی صاحب! اِدھر ایک بندے کو گولی لگی تھی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کے ساتھی اسے کہاں لے گئے ہیں؟"

اندر سے آواز آئی۔ "ہم کچھ نہیں جانتے' گولی کھانے والے تھانے میں ملیں گے یا کسی اسپتال میں۔ تم اِدھر سے جاؤ ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر وہاں سے جانے لگی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہاں جائے اسے کہاں تلاش کرے' پتا نہیں وہ کس تھانے یا اسپتال میں ہو گا؟

وہ اس گلی سے نکل کر پھر مین روڈ کی طرف جانے لگی۔ اس کا سارا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ایک مجرمانہ زندگی گزارنے والے کے لئے بھٹک رہی ہے۔ پولیس والوں کو پتہ چلے گا کہ ایک دہشت گرد سے اس کا تعلق ہے تو وہ اس کا جینا حرام کر دیں گے۔ وہ اسے بار بار تھانے میں بلائیں گے اور اس کے والدین اور اس کے خاندان کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں گے۔

وہ ایک بس میں بیٹھ کر گھر آگئی۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ ہمنوا نے کہا تھا کہ اسے چھ بجے نواب صاحب کو فون کرنا چاہئے۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی سے بات کرے۔ وہ کسی طرح بھی سکندر کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ اس بار اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے دو ٹوک باتیں کرے گی۔ اس سے ایک ہی جواب چاہے گی کہ مجرمانہ زندگی سے باز آئے گا یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر وہ ماں باپ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے گی۔ چوری ڈکیتی' قتل و غارت گری کے مرتکب ہونے والے کو پلٹ کر نہیں دیکھے گی۔ یہ آخری فیصلہ کرنے کے لئے اس سے ملنا ضروری تھا۔

وہ بستر پر آ کر گر پڑی۔ اسے رات کو کچھ کھانے کے لئے کچن میں جا کر پکانا چاہئے تھا۔ گھر کی صفائی بھی کرنی تھی لیکن وہاں سے اٹھ کر کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسپتال سے آنے کے بعد بوڑھے ماں باپ کی نیک نامی اور خوش حالی کے لئے تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ یہ جذبہ مستحکم تھا کہ وہ ایک عزت دار لڑکی کی طرح صاف ستھری زندگی گزارنا چاہ رہی تھی۔ بس وہ ایک ہرجائی تھا جو اس کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا تھا۔

وہ اسے نہ اُگل سکتی تھی نہ نگل سکتی تھی۔

گھڑی میں پانچ بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ چھ بجنے والے تھے۔ اسے پی سی او جا کر اخلاقاً فون کرنا چاہئے تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بڑی کشمکش میں تھی کہ فون کرے یا نہ کرے؟ اگر نواب صاحب سے کھل کر بات نہیں کرنی تو یہ کہہ کر ٹال سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے دن ان سے رابطہ کرے گی۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے ایک گلی کے بعد دوسری گلی میں پی سی او تھا۔ اس نے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولا تو اسی وقت ایک بڑی سی جیپ مکان کے سامنے آکر رکی۔ اس میں چار افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ غزل نے سکندر کے ساتھیوں کو پہچان لیا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آئی پھر ان سے بولی۔ "سکندر کہاں ہے؟"

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے سر جھک گئے۔ ایک نے کہا۔ "وہ دن رات تمہاری باتیں کیا کرتا تھا۔"

لفظ۔ "تھا" سن کر غزل کا کلیجہ دھک سے رہ گیا، وہ بے یقینی سے اس کا منہ تکنے لگی ۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس کے ایک پاؤں میں گولی لگی تھی۔ دو ساتھی اسے اٹھا کر ایک مکان میں لے گئے تھے۔ پولیس نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ انہیں باہر نکلنے کا حکم دے رہے تھے۔ اس کے ساتھیوں کے پاس ٹی ٹی اور کلاشنکوف کے علاوہ خطرناک دھماکہ کرنے والے بم بھی تھے۔"

جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "وہ گھنٹوں پولیس کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن پتہ نہیں مکان کے اندر ایک بم کس طرح پھٹ پڑا۔ ان تینوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ ہمارا ایک آدمی پولیس کی نظروں میں مشکوک نہیں ہے۔ اس نے وہاں جا کر ٹکڑے دیکھے۔ کسی کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔"

غزل منہ میں دوپٹے کو ٹھونس کر چیخیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ محلے کی دو چار عورتیں اور مرد بھی وہاں آ گئے تھے۔ وہ چاروں اسے بتا رہے تھے۔ "سکندر تمہارے امی اور ابو کا بہت احسان مند تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا اور اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا تو ان بزرگوں نے اسے پناہ دی تھی۔"

ایک پڑوسن نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ اسے کیا ہوا؟"

جیپ ڈرائیو کرنے والے نے بات بتائی۔ "وہ اپنے گھر جا رہا تھا' اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ بے چارے کو چھپنے کی جگہ نہیں ملی۔ کہیں سے ایک گولی آکر اسے لگی۔ بے چارہ گرنے کے بعد اٹھ نہیں سکا۔ ہم اطلاع دینے آئے تھے اب جا رہے ہیں۔"

وہ جیپ اسٹارٹ کر کے چلے گئے۔ محلے کے مرد افسوس کرنے اور ایسے خون خرابے پر تبصرہ کرنے لگے۔ عورتیں غزل کو تسلیاں دینے لگیں۔ اسے گھر کے اندر لے آئیں ایک نے کہا۔ "تمہارے ابو اسپتال میں ہیں' تمہاری امی تیمار داری میں لگی ہوئی ہیں تم یہاں اکیلی ہو۔ کیا اس کے گھر میں جا سکو گی۔"

غزل نے انکار میں سر ہلا دیا اور کہا۔ "میں ان کا گھر نہیں جانتی۔ اگر جانتی تب بھی ابو کے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔"

دوسری پڑوسن نے کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹی' یہ تو مجبوریاں ہیں۔ تمہارے ابو کو اسپتال سے آنے میں کچھ روز لگیں گے۔ تم شہید ہونے والے کے لئے کلامِ پاک کی تلاوت کرو اس کے لئے دعائیں کرو۔"

سکندر کے لئے شہید کا لفظ سن کر غزل کا سر شرم سے جھک گیا۔

وہ عورتیں تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد چلی گئیں۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ بہت دیر سے پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہ رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہی دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی پھر اپنے سینے پر گھونسے مار مار کر رونے لگی۔ اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔ دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔ ماں باپ سکندر سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہتے رہے تھے' وہ خود ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

وہ دوراہے پر کھڑی تھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کس راستے پر جانا چاہئے۔ اگر وہ مجرمانہ زندگی سے باز نہیں آئے گا تو وہ اس کی محبت سے کیسے باز آئے گی۔ شریف زادیاں ایک بار ہی کسی کو اپنا تن من دیتی ہیں وہ کس دل سے اسے چھوڑے گی؟

وہ جو چور بدمعاش دہشت گرد تھا اس نے اچانک ہی تمام کشمکش سے اسے نجات دلا دی تھی۔ وہ بدی کی علامت تھا' جاتے جاتے نیکی کر گیا۔

آج نہیں تو کل اس کے زخم بھر جائیں گے پھر وہ ایک مثبت فعال زندگی گزارنے لگے گی۔ اچانک بدل جانے والے حالات یہی کہہ رہے تھے۔

☆======☆======☆

نواب سعداللہ جان بے چینی سے ڈرائنگ روم میں ٹہل رہے تھے۔ وہ خلافِ معمول دفتر سے جلدی آگئے تھے اور ہمنوا کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا روانہ کیا ہوا کبوتر پیغام لے کر واپس آنے والا تھا۔ ان کے معمولاتِ کی تبدیلی کو گھر کے ہر فرد نے محسوس کیا تھا۔

وہ ہمیشہ دفتر سے آکر ماہ لقا بیگم کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ آج وہ انہیں بیڈ روم میں لے کر گئے تو پندرہ منٹ کے بعد ہی واپس ڈرائنگ روم میں آگئے۔ تمام رشتے دار تجسس میں مبتلا تھے۔ مہوش بھٹکتی ہوئی ماہ لقا کے کمرے میں آگئیں۔ بہن سے بولیں۔

"کیا بات ہے آج بھائی صاحب جلدی آگئے ہیں۔ کوئی آنے والا ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ بزرگ شاعر ہمنوا آئیں گے۔"

"معلوم ہوتا ہے کوئی خاص بات ہے۔ بڑی بے قراری سے انتظار کیا جا رہا ہے۔"

"آپ جانتی ہیں' میں ان معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ ان کے مزاج کو سمجھتی ہوں وہ زیادہ چھان بین پسند نہیں کرتے اور میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی۔"

"ماہ لقا تم جان بوجھ کر انجان بنتی ہو۔ میں تمہاری سگی بہن ہوں اور تم مجھ سے اپنے دل کی بات چھپاتی ہو۔"

"نہیں آپا! بھلا میرے دل میں کیا بات ہوگی؟"

"تم ان کی دوسری شادی کے سلسلے میں اوپری دل سے راضی ہو ورنہ اندر سے ٹوٹ رہی ہو۔ دنیا کی کوئی عورت سوکن برداشت نہیں کرتی۔"

"میں ایک سیدھی سی بات جانتی ہوں۔ میں خاوند کو اولاد نہیں دے سکتی۔ وہ اولاد کے لئے' اپنے وارثوں کے لئے دوسری شادی کا حق رکھتے ہیں۔"

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "یہ دوسری شادی کا معاملہ میرے لئے تلخ بھی ہے اور خوش آئندہ بھی۔ تلخ اس لئے کہ آنے والی سوکن برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ دل کھٹا ہو رہا ہے۔ اپنے آپ کو تسلیاں دیتی ہوں کہ سوکن سمجھ دار ہوگی' تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ میری معذوری کا خیال کرے گی۔ مجھ سے محبت کرے گی پھر شاید ہم ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے لگیں۔"

مہوش نے کہا۔ "میں لکھ کر دیتی ہوں۔ وہ کبھی تمہارے مزاج کو نہیں سمجھے گی۔ سوکن پھر سوکن ہوتی ہے۔ تم آگ کو آگ نہیں سمجھو گی تو بری طرح جھلس جاؤ گی۔"

"آپا آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ آپ اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔ میں سنبھلنا چاہتی ہوں' مجھے سنبھلنے دیں۔ میرے اندر ہلچل نہ پیدا کریں۔ ہو سکے تو مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

مہوش زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ نواب سعداللہ جان کی گاڑی ہمنوا کو لے کر آگئی تھی۔ سعداللہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور کہا۔

"آپ مقررہ وقت سے پہلے آئے ہیں لیکن ہماری بے چینی کا یہ عالم ہے کہ ہم ایک گھنٹہ پہلے فیکٹری سے آگئے۔ ہمیں یوں لگ رہا ہے جیسے ہم جلدی نہیں آئے آپ دیر سے آئے ہیں۔"

اس بات پر دونوں قہقہے لگانے لگے۔ ایک ہی صوفے پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے تاکہ رازداری سے گفتگو ہو سکے۔ ایک ملازم چائے اور ناشتے کی ٹرالی لے آیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "ہمیں ایک مصرع یاد ہے۔ ہم نے سوچا تھا جیسے ہی آپ دیر سے آئیں گے تو ہم کہیں گے۔" ع

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

اس بات پر دونوں کے قہقہے گونجنے لگے۔ نواب سعداللہ جان بہت خوش تھے۔ یہ خوش فہمی تھی کہ ہمنوا خوش خبری سنانے آئے ہیں۔ انہوں نے مٹھائی کی ایک پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے میٹھا لیں پھر نمکین کھائیں' اس کے بعد چائے پھیکی نہیں لگے گی۔"

ہمنوا نے مٹھائی لیتے ہوئے کہا۔ "میں پہلی بار غزل کے گھر گیا۔ بڑی حوصلہ مند لڑکی ہے۔ پورے گھر کی ذمہ داریاں تنہا سنبھال رہی ہے۔"

"ماشاء اللہ۔ ہم نے پہلی ملاقات میں اندازہ لگا لیا تھا کہ سنجیدہ اور باوقار ہے۔"

"پہلے میں اس کے گھریلو حالات بیان کر رہا ہوں۔ اس کے ابو اسپتال میں ہیں۔ آج ان کے گلے کا آپریشن ہوا ہوگا۔"

"اوہ' ہمیں معلوم ہوتا تو ہم ان کے علاج کے لئے سہولتیں مہیا کرتے۔"

"اور وہ امداد قبول نہ کرتے۔ وہ بہت غریب ہیں مگر بلا کے خود دار ہیں۔ اس سے آپ ان کی شرافت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔"

"بے شک۔ بے شک انسان کے عمل سے اس کی خود داری اور شرافت کا ثبوت ملتا ہے۔ آج وہ غریب ہیں اللہ نے چاہا کل ان کے حالات سنور جائیں گے۔ ہم نے غزل کو ملازمت کی اچھی آفر دی تھی۔ تعجب ہے ایسی تنگ دستی میں اس نے اسے قبول کیوں نہیں کیا؟"

"ہم درمیانے طبقے کے لوگ ہیں۔ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے گھر کے اندر فاقے کرلیتے ہیں لیکن باہر ڈکار لیتے رہتے ہیں جیسے روز مرغن کھا رہے ہوں۔"

"آپ نے عمدہ بات کہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسا ہو رہا ہے۔ غزل بھی اپنے صحیح حالات اسی لئے چھپا رہی ہے۔ جب تک شناسائی اور اعتماد نہ ہو' تب تک کوئی اپنا اصلی چہرہ نہیں دکھاتا۔"

"میں نے اس کی امی سے تنہائی میں آپ کے متعلق گفتگو کی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔" وہ خوش ہو کر ہمنوا کے ذرا قریب ہو گئے۔

ہمنوا نے کہا۔ "میں نے آپ کی پُروقار شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ حیرانی سے منہ کھولے سنتی رہیں۔ آپ کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئیں۔ بے یقینی سے پوچھنے لگیں۔ "نواب صاحب' رئیس ابن رئیس ہیں۔ کیا ایک غریب کی بیٹی کو اپنے گھر کی عزت اور غیرت بنائیں گے؟"

"اچھا۔ اچھا۔" انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے کیا جواب دیا۔"

میں نے کہا۔ "نواب صاحب اونچ نیچ کے فرق کو نہیں مانتے۔ ایسے باکردار ہیں کہ تہذیب اور شرافت کو پستی میں دیکھتے ہیں تو اپنی بلندی سے جھک کر اسے اٹھا لیتے ہیں۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ ہمنوا صاحب آپ کی گفتگو کا انداز خوب ہے۔ آپ نے تو ہمیں ان کے حواس پر مسلط کر دیا ہو گا۔"

"اور نہیں تو کیا۔ یوں سمجھیں کہ نیم رضامندی حاصل کرلی ہے۔ میں آدھا میدان مار کر آیا ہوں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ابھی تو گھر کا بڑا اسپتال میں ہے۔ ایک ہفتے میں وہاں

سے چھٹی ملے گی اور گھر آئیں گے تو پھر کسی دن آپ سے ملاقات کریں گے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے دو چار ملاقاتیں ضروری ہیں۔"

"بے شک۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ پہلے ایک دوسرے کو پرکھ لیا جائے۔ سمجھ لیا جائے۔ آپ باتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ کھا نہیں رہے ہیں۔ کچھ نمکین لیں۔"

وہ ایک سموسہ اٹھا کر کھانے لگے۔ سعداللہ جان بے قراری سے ان کا منہ تک رہے تھے جیسے کچھ سننے کے منتظر ہوں۔ ہمنوا ان کی بے چینی کو نہیں سمجھ رہے تھے۔ کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ پورا ایک سموسہ کھانے کے بعد دوسری چیزیں کھانے لگے۔ آخر انہوں نے خود ہی شرماتے ہوئے پوچھا۔ "ہمارے متعلق غزل کی کیا رائے ہے؟ ہمارا مطلب ہے آپ نے ہمارے سلسلے میں کچھ تو کہا ہو گا۔"

ہمنوا نے کہا۔ "پہلے تو ہم نے اس سے شکایت کی اور کہا نواب صاحب کو بھی تم سے شکایت ہے۔ وہ تمہاری شاعری سے اس قدر متاثر ہیں کہ اکثر تمہاری گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ تم تین ماہ سے ایک بار بھی مشاعرے میں نہیں آئیں۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ "ہمنوا صاحب! آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ہماری غزل کو شرمندہ کر دیا۔ بھئی! ان کا ذکر کرتے رہیں بڑا لطف آرہا ہے۔"

"میں نے ان سے پہلے یہ نہیں بتایا کہ آپ اسے اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتے ہیں۔"

"اچھا آپ نے اس سے گفتگو کیسے شروع کی؟"

"اس طرح کہ آپ اس کے لئے فکر مند رہتے ہیں۔ اسے فکرِ معاش سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے پہلی ملاقات میں ہی آپ نے ایک بہت اچھی ملازمت کی پیش کش کی تھی۔"

"بے شک ہم پہلی ملاقات میں ہی اس کے کام آنا چاہتے تھے۔ یہ بتائیں اس نے کیا جواب دیا؟"

"وہ کہہ رہی تھی۔ آپ بلاشبہ ایک حساس دل رکھنے والے انسان ہیں۔ دوسروں کی پریشانیوں کو سمجھتے ہیں۔ آپ نے اس کے چہرے سے اس کی پریشانیوں کو بھانپ لیا

تھا۔ وہ خود کو چھپا رہی تھی اور آپ اسے کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑھ رہے تھے۔"

وہ خوشی سے کھل گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا وہ ایسا کہہ رہی تھی؟"

"جی ہاں' خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آپ کے متعلق یہ اس کے الفاظ ہیں۔ اس نے جو کہا اسے لفظ بہ لفظ سنا رہا ہوں۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے ملازمت کی پیش کش کو کیوں نظر انداز کر دیا؟"

"اس کے حالات نے اسے مجبور کر دیا ہے۔ اس کے والد مسلسل بیمار رہتے ہیں۔ اس کی امی انہیں اسپتال لے جایا کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں اسے گھر ہی میں رہنا پڑتا ہے۔ وہ ہر روز ملازمت کے لئے گھر سے نہیں نکل سکتی۔"

"اس کے حالات ایسے ہیں تو ہمیں جلد از جلد کسی طرح اس کے کام آنا چاہئے۔ آپ کوئی ایسی صورت نکالیں کہ وہ ہمارا تعاون حاصل کرنے کے لئے راضی ہو جائے۔"

"جناب! جلد بازی مناسب نہیں ہو گی۔ اگر وہ ایسی ویسی لڑکی ہوتی تو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی۔"

"بے شک۔ ہم مانتے ہیں۔ وہ بہت خود دار ہے۔ ہمارے مزاج اور ہمارے معیار کے مطابق ہے۔ آپ ہماری بے قراری کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں نکل سکتی کہ وہ ہم سے فون پر گفتگو کرلے۔"

ہمنوا نے اپنا سینہ تان کر کہا۔ "جناب! آپ اپنے ہمنوا کو سمجھتے کیا ہیں؟ ہم نے استاد ہونے کا فائدہ اٹھایا ہے۔ جانتے ہیں ہم نے اس سے کیا کہا؟"

"آپ تو ہمیں بے قرار کئے جا رہے ہیں۔ خدارا جلد بتائیں' آپ نے کیا کیا ہے؟"

ہم نے اس سے کہا۔ "شاگرد اپنے استاد کو نذرانہ دیا کرتے ہیں۔ میں بھی تم سے نذرانہ چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میری حیثیت کے مطابق جو مانگیں گے میں دوں گی۔"

ہم نے فوراً کہا۔ "ہماری ایک بات مان لو۔ نواب صاحب سے فون پر رابطہ رکھو۔ آج چھ بجے شام کو فون پر ان سے گفتگو کرو۔"

سعد اللہ جان نے فوراً ہی وال کلاک کی طرف دیکھا۔ چھ بجنے کے لئے بیس منٹ رہ گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا ابھی فون پر گفتگو ہو سکے گی؟"

"ضرور ہو گی۔ ایک شاگرد نے اپنے استاد کو زبان دی ہے۔"

وہ خوشی سے جھوم گئے۔ "آپ نے تو ہمیں خرید لیا ہے۔ آئندہ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے کسی بھی آڑے وقت میں یہ ناچیز ہمیشہ کام آئے گا۔"

"جناب! یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے ہماری مصیبت کے وقت کام آکر انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ میں غزل کو آپ کی دلہن بنا کر اس گھر میں ضرور لاؤں گا۔"

سعد اللہ جان خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وقت گزرتا جاتا تھا۔ چھ بج گئے پھر ساڑھے چھ بج گئے وہ بے چین ہو رہے تھے' کبھی اٹھ کر بیٹھ رہے تھے۔ کبھی ٹہل رہے تھے۔ زیر لب کہہ رہے تھے کہ آج کل کی لڑکیوں میں یہی ایک خرابی ہے کہ یہ وقت کی پابند نہیں ہوتیں۔

ہمنوا نے کہا۔ "آپ ذرا صبر کریں۔ ایک تو وہ گھر میں اکیلی ہو گی۔ ماں باپ اسپتال میں ہیں پھر پتا نہیں اس کے گھر سے پی سی او کتنی دور ہے۔ وہ میری شاگرد ہے' مجھے زبان دے کر نہیں پھرے گی۔ وہ ضرور فون کرے گی۔"

"یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے کہ اس کے ساتھ ایسی مجبوریاں ہیں پھر تو ہمیں امید رکھنا چاہئے۔"

سات بج گئے۔ میز پر ان کا فون خاموش پڑا تھا۔ گھنٹی نہیں بج رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں گھنٹے کی طرح بج رہی تھیں۔ ہمنوا بھی فکر مند ہو گئے۔ نواب صاحب کے سامنے ان کی سبکی ہو رہی تھی۔ ایک شاگرد نے ان کی بات نہیں رکھی تھی۔ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو رہے تھے۔

انہوں نے ایک بات بتائی۔ "اس کے والد کا آپریشن ہونے والا تھا۔ پتا نہیں آپریشن کامیاب رہا یا نہیں۔"

سعد اللہ جان نے تائید میں سر ہلایا پھر کہا۔ "ہم بے قرار ہیں اور اس کی پریشانیاں نہیں سمجھ رہے ہیں۔ خدانخواستہ آپریشن ناکام ہو گیا تو اس نازک سی جان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔"

ہمنوا کو اطمینان ہوا کہ نواب صاحب غزل کے مسائل اور مجبوریوں کو سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ سبکی نہیں ہو گی کہ شاگرد نے ان کی بات نہیں رکھی۔ سعد اللہ جان نے

کہا۔ "وہ پریشانیوں کے باعث ہم سے رابطہ نہیں کر سکیں گی۔ ہم تو رابطہ کر سکتے ہیں۔ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ان کے گھر جا سکتے ہیں۔ اسپتال بھی جا سکتے ہیں۔"

"بے شک......... انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ہمیں خیریت معلوم کرنے کے لئے جانا چاہئے لیکن وہ........."

وہ کہتے کہتے رک گئے فون کی گھنٹی بجی۔ سعد اللہ جان نے ریسیور اٹھایا پھر کان سے لگا کر کہا۔ "ہم ہیں نواب سعد اللہ جان۔"

دوسری طرف سے رونے اور سسکنے کی دھیمی سی آوازیں آنے لگیں۔ وہ حیران ہوئے پھر بولے۔ "آپ......... ؟ غزل! یہ آپ ہیں؟"

رونے اور سسکنے کے دوران میں ہاں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمنوا کو حیرانی سے کہا۔ "وہ رو رہی ہیں۔ خدا خیر کرے' کوئی المناک خبر ہو سکتی ہے۔"

پھر وہ ماؤتھ پیس سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "غزل! بخدا آپ کے آنسو ہمیں رُلا دیں گے۔ ہم آپ کے غمگسار ہیں۔ آپ کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ آپ کے ابو خیریت سے ہیں؟"

وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ "جی......... جی ہاں۔"

وہ بولے۔ "خدا کا شکر ہے۔ وہ خیریت سے ہیں پھر کیا پریشانی ہے؟ کیا ان کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔"

"جی نہیں۔ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ وہ خیریت سے ہیں۔"

"آپ نے ہمارا دل ہلا دیا تھا۔ ویسے آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

وہ سسکیوں کے درمیاں بولی۔ "میرے کزن کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خدا مغفرت کرے۔ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ایسے وقت میں ہمیں عملی طور پر آپ کے غم میں شریک رہنا چاہئے۔ ہم ابھی ہمنوا صاحب کے ساتھ گاڑی لے کر آ سکتے ہیں۔ آپ کو والدین کے پاس اسپتال پہنچا سکتے ہیں۔"

روتے رہنے کے باعث اس کی آواز کچھ اور مترنم ہو گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ اج ہی ابو کا آپریشن ہوا ہے۔ میں اسپتال جا کر انہیں ایسی المناک خبر نہیں سناؤں گی۔ انہیں صدمہ نہیں پہنچاؤں گی۔"

"ماشاء اللہ آپ بہت سمجھ دار ہیں۔ بے شک وہ بیمار ہیں۔ انہیں کوئی المناک خبر نہیں سنانی چاہئے۔ ایسے وقت ہم چاہتے ہیں کہ ہر طرح آپ کے کام آئیں۔ کیا آپ ہمیں خدمت کا موقع نہیں دیں گی۔"

"میں ابھی زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گی۔ گھر میں تالا لگا کر آئی ہوں۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔ آپ اجازت دیں میں فون بند کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہم آپ کی ذہنی حالت کو سمجھتے ہیں۔ آپ کو گھر جا کر آرام کرنا چاہئے لیکن وعدہ کریں کل آپ فون کریں گی۔ ہم تمام دن فیکٹری کے نمبر پر ملیں گے اور شام کے بعد گھر کے نمبر پر۔"

"یہاں ایک ہی پی سی او ہے اور یہ اکثر بند رہتا ہے پھر بھی میں رابطہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

فون بند ہو گیا۔ سعد اللہ جان نے ریسیور کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ اسے بے اختیار سینے سے لگایا۔ ان لحات میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ غم زدہ لڑکی ان کے سینے سے لگ گئی ہو۔ انہیں اپنا سمجھ کر ان کی قمیض کو آنسوؤں سے بھگو رہی ہو۔ انہوں نے ہمنوا سے کہا۔ "کیا ہی اچھا ہوتا وہ ایسے وقت ہمارے پاس ہوتی۔ ہم اسے تسلیاں دیتے اور اس کے آنسو پونچھتے۔ ان کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا ہمیں تعزیت کے لئے نہیں جانا چاہئے۔"

"غزل تنہا رہتی ہے۔ ہمارا ابھی وہاں جانا مناسب نہیں ہو گا۔ پھر وہ انتہائی پسماندہ علاقہ ہے۔ وہ علاقہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں کل ہی صبح اس سے ملنے جاؤں گا پھر فون کے ذریعے آپ سے باتیں کراؤں گا۔"

وہ ابھی تک سینے سے ریسیور لگائے ہوئے تھے۔ اس بات سے مطمئن ہو گئے تھے کہ ہمنوا وہاں جا کر ان کی غم زدہ معشوق سے رابطہ کرائیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ شادی کے معاملات جلد ہی طے ہو جائیں۔ اسی مہینے شادی ہو جائے لیکن کسی عزیز کی موت ان کی شادی خانہ آبادی کو کم از کم چالیس دن کے لئے ملتوی کر رہی ہے۔ وہ چالیسویں سے

پہلے اپنے سر پر سہرا نہیں باندھ سکتے تھے۔

☆======☆======☆

صبح ہوتے ہی وہ اسپتال پہنچ گئی۔ اس کی امی نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم اتنی صبح آئی ہو۔ خیریت تو ہے؟"

اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ پچھلی رات وہ کبھی روتی رہی تھی کبھی سوتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ یا تو بیمار ہے یا پھر حالات کی ٹھوکروں نے اس کا یہ حلیہ بدل دیا ہے۔

وہ سر جھکا کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ابو سو رہے تھے۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بول نہیں پا رہی تھی۔ اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "امی......... وہ......... سکندر........."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ منہ چھپا کر رونے لگی۔ ماں ایک دم سے گھبرا گئی۔ یہی سمجھ میں آیا کہ سکندر نے اس کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک کیا ہے۔ کوئی غلط حرکت کی ہے۔ بیٹی کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "میں جانتی تھی وہ لچا لفنگا جب تمہیں پریشان کرے گا اور آٹھ آٹھ آنسو رُلائے گا تب ہی تمہیں عقل آئے گی۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "امی خدا کے لئے انہیں کچھ نہ کہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

ماں کا منہ حیرانی اور بے یقینی سے کھل گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ بیٹی نے وہی کہا جو انہوں نے ابھی سنا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ اس دنیا میں کون نہیں رہا؟ کس کی بات کر رہی ہو؟

وہ روتے روتے گہری سانس لے کر بولی۔ "وہی جنہیں آپ کوستی تھیں اور بددعائیں دیتی تھیں۔"

انہوں نے پھر بے یقینی سے پوچھا۔ "سکندر؟"

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایک بم دھماکہ ہوا اور وہ......... وہ........."

اس نے دوپٹے کا ایک حصہ منہ میں ٹھونس لیا۔ باہر آنے والی چیخوں، آہوں اور

سسکیوں کا گلا گھونٹنے لگی۔ ماں نے ایک گہری سانس لی جیسے اچانک ایک پہاڑ کا شیطانی بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔

وہ دوسری طرف گھوم گئیں۔ بیٹی سے منہ چھپا لیا تاکہ وہ ان کے چہرے سے اطمینان اور آسودگی نہ پڑھ لے۔ دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں۔ "تُو رحمان ہے رحیم ہے کریم ہے۔ تُو ہی عزت دیتا ہے اور تُو ہی ذلت دیتا ہے۔ اس لڑکی کی نادانی سے ذلتیں ملنے والی تھیں۔ تیرے کرم سے عزت اور نیک نامی کی راہیں کھل رہی ہیں۔"

اس کے ابو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خاموش پڑے ہوئے تھے۔ بیٹی کو روتے اور بیوی کو منہ پھیر کر سوچتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہلکی کھانسی ہوئی دونوں نے سر گھما کر انہیں دیکھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ بولنے کے قابل ہو گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ کیوں رو رہی ہے؟" وہ ان کے قریب آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گئیں اور پھر بولیں۔ "سکندر........."

وہ آگے بولنے سے پہلے رک گئیں۔ اس الجھن میں پڑ گئیں کہ کیا بولنا چاہئے؟ سکندر مر گیا؟ یا وفات پا گیا؟ یا حرام موت مارا گیا یا شہید ہو گیا؟ انسان کے اعمال کے مطابق اس کے بارے میں زبان کھولی جاتی ہے۔ ماں اپنی بیٹی کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آسودگی کے لئے کہہ دیا۔ "وہ......... ہمارا سکندر۔ اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

انہوں نے بڑی تکلیف سے یہ بات کہی۔ غزل نے سر گھما کر ماں کو دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ طعنہ دے رہی ہوں۔ انہوں نے کبھی اسے پیارا نہیں سمجھا آج اللہ کا پیارا بنا رہی ہیں۔

اس کے ابو نے یہ خبر سنی تو ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے گلے کے تکلیف کے باعث سر نہیں گھما سکتے تھے۔ منہ نہیں چھپا سکتے تھے اس لئے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سکندر کے لئے افسوس ظاہر کر سکتے تھے۔ دعا کے طور پر دو بول بول سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ ان کی عزت اور غیرت کا دشمن بھاری پتھر کی طرح ہٹ گیا تھا۔ موت سبھی کو آنی ہے۔ برے کو آتی ہے تو اچھے کو بھی آتی ہے۔

وہ سوچ رہے تھے کہ میں اسپتال کے بیڈ پر پڑا ہوں۔ زندگی کے آخری اسٹیشن کو

اسپتال کہتے ہیں۔ یہاں سے مقدر والے ہی زندگی کی طرف لوٹتے ہیں ورنہ یہاں سے قبرستان کا دروازہ کھلتا ہے۔ میں بھی یہاں سے موت کی طرف جا سکتا ہوں۔ یا خدا! مجھے معاف کرنا۔ میں سکندر کی موت سے خوش نہیں ہوں لیکن آپ ہی آپ مطمئن ہو رہا ہوں۔ اب میری عزت اور غیرت پر آنچ نہیں آئے گی۔

اس کی امی نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بم دھماکے میں چل بسا ہے؟"

وہ بولی۔ "اس کے ساتھی آئے تھے۔ جب وہ مجھے یہ خبر سنا رہے تھے تو وہاں محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب افسوس ظاہر کر رہے تھے۔"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر بولی۔ "جب وہ پہلی بار آئے تھے تو ہمارے گھر ہی رہا کرتے تھے۔ محلے والے انہیں ہمارا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے۔ آج بھی وہ یہی سمجھتے ہیں۔"

اس کے ابو آنکھیں کھول کر اسے دیکھ رہے تھے' وہ کہہ رہی تھی۔ "میں آپ سے ایک التجا کرنے آئی ہوں۔ وہ جیسے بھی تھے اپنے اچھے برے اعمال کے ساتھ چلے گئے۔ آپ کسی سے ان کی اصلیت بیان نہ کریں۔ میں نے نواب سعداللہ جان سے بھی فون پر یہی کہا ہے کہ وہ ہمارے اپنے تھے۔"

ماں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہمیں سکندر کا نادان دشمن نہ سمجھو۔ یوں مرنے والے کی برائیاں نہیں کی جاتیں۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "ہم اسے عزت دیں گے۔ تم اپنی ماں کے ساتھ گھر جاؤ۔ مجھے یہاں کوئی پریشان کرنے والا نہیں ہے۔ وہاں محلے والوں کو اس کے سوئم میں بلاؤ۔ قرآن خوانی کراؤ۔ اس کی مغفرت کے لئے دعا کراؤ۔ ہم اسے اسی طرح عزت دے سکتے ہیں۔"

بیٹی نے باپ کو بڑی محبت سے دیکھا۔ زبان سے ان کا شکریہ ادا نہیں کیا لیکن بڑی عقیدت سے ان کے پاؤں دابنے لگی۔ وہ تینوں خاموش ہو گئے تھے۔ اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ محلے والے یہ جانتے تھے کہ سکندر ان کا رشتہ دار ہے۔ اس کے والدین لاہور میں رہتے ہیں۔ اب لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ اس کی میت لاہور لے جائی گئی ہے۔ وہ بیماری اور آپریشن کے باعث وہاں نہیں جا سکتے لہٰذا مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کرائی جا رہی تھی۔ ان تینوں نے وہاں بیٹھ کر یہ طے کر لیا کہ ملنے جلنے والوں کے سامنے

سکندر کے سلسلے میں یہی بیان دیا جائے گا۔

وہ ماں بیٹی اسپتال سے گھر آ گئیں۔ مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کرا دیا کہ سکندر کی وفات کے سلسلے میں دوسری صبح قرآن خوانی ہے۔ قرآن خوانی کے ساتھ کچھ کھانے پینے کے انتظامات بھی کرنے تھے۔ اس کے لئے اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ وہ اپنی موت سے پہلے اپنے سوئم اور چالیسویں کے لئے غزل کو دس ہزار روپے دے گیا تھا۔

دوپہر کے وقت غزل کے استادِ محترم ہمنوا آ گئے۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ وہ سکندر کے بارے میں افسوس ظاہر کرنے لگے۔ اس کی امی نے کہا۔ "کل صبح قرآن خوانی ہے۔ کیا آپ تشریف لائیں گے؟"

"میں ضرور آؤں گا یہاں بیٹھ کر تلاوت کروں گا۔"

پھر انہوں نے غزل سے پوچھا۔ "تمہارے ابو کی طبیعت کیسی ہے۔ وہ تو اسپتال میں تنہا ہوں گے۔"

وہ بولی۔ "آج وہ تنہا رہ سکتے ہیں۔ اس لئے امی میرے ساتھ آ گئی ہیں۔"

اس کی امی نے کہا۔ "میرے دن رات ایسے ہی گزر رہے ہیں۔ گھر سے اسپتال اور اسپتال سے گھر۔ یہاں بیٹی کو تنہا چھوڑنا پڑتا ہے۔"

"یہ آپ ماں بیٹی کا حوصلہ ہے۔ نہ جانے کتنے مسائل سے دوچار ہو رہی ہیں۔ دن بہ دن مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے' اخراجات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اس دنیا سے اٹھ جائیں تو ہمارے بعد بھی بوجھ کم نہیں ہوتا۔ ہمارے سوئم اور چالیسویں پر ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اگر آپ مجھے پوچھنے کا حق دیں تو میں یہ ضرور معلوم کرنا چاہوں گا کہ یہ اخراجات کیسے برداشت کر رہی ہیں۔"

وہ بولیں۔ "مرحوم کی کچھ رقم ہمارے پاس امانت کے طور پر رکھی ہوئی ہے۔ ہم اسے خرچ کر رہے ہیں۔ اس نے جو بچت کی تھی' وہ اسی کے کام آ رہی ہے۔"

"چلیں اس طرح تو آپ کا مسئلہ حل ہو رہا ہے لیکن دوسرے مسائل سے آپ کس طرح نمٹ رہی ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ غزل ملازمت کی آفر قبول کر لیتی؟"

اس بات پر ماں نے بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی نے سر جھکا لیا۔ آئندہ اچھے برے حالات سے نمٹنے کے لئے آمدنی کا کوئی ذریعہ بنائے رکھنا لازمی تھا۔

اس کی امی نے کہا۔ "حالات کا تقاضا ہے کہ غزل کو ملازمت کر لینی چاہئے لیکن آپ رشتے کی بات چھیڑ چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ میری بیٹی کا فیصلہ کیا ہو گا؟ میری طرف سے اور اس کے ابو کی طرف سے رضا مندی ہے۔ نواب صاحب سے ملاقات کے بعد ہماری طرف سے ہاں ہو سکتی ہے۔"

غزل سر پر آنچل سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی پھر ڈرائنگ روم سے باہر آکر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ "اب آپ سمجھ سکتے ہیں۔ جہاں رشتہ ہونے والا ہے وہاں بیٹی کو ملازمت نہیں کرنی چاہئے۔"

"آپ درست فرما رہی ہیں۔ میں آپ سے متفق ہوں لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ گھریلو مسائل' مہنگائی' دکھ' بیماریاں ان سے نمٹنے کے لئے مخصوص آمدنی ضروری ہے۔ کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ اس گھر کے لئے آمدنی کا ایک ذریعہ ہو جائے اور آپ کی غیرت کو ٹھیس نہ پہنچے۔"

"ایسا کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے؟ میری عقل تو کام نہیں کرتی۔ ہمارے پاس کوئی جمع پونجی نہیں ہے۔ اگر چند مشینیں خرید کر سلائی کا کارخانہ کھولنا چاہیں تو اس کے لئے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہو گی۔ ہمارے پاس نہ اتنی رقم ہے نہ اس کے ابو کسی سے قرض لیں گے۔"

"قرض لینے میں کیا حرج ہے؟ جو آمدنی ہو گی اس سے قرض اتارتے جائیں آپ راضی ہو جائیں تو میں لاکھ دو لاکھ روپے کا انتظام کر دوں گا۔"

"اتنا تو میں سمجھتی ہوں کہ آپ نواب صاحب سے یہ رقم لے کر آئیں گے۔ آپ ہماری بہتری کے لئے ایسی باتیں کر رہے ہیں لیکن ہماری غیرت اور خود داری کو نظرانداز کر رہے ہیں۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ آپ سے عرض کرتا ہوں۔ اس معاملے میں نواب صاحب کو نظرانداز کر دیں۔ میں آپ کو لاکھ دو لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔"

"نہیں بھائی' خدانخواستہ کاروبار میں نقصان ہو گیا تو آپ کی رقم ڈوب جائے گی۔ اس کے ابو کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ آپ کوئی دوسری بات کریں۔" پھر انہوں نے آواز دی۔ "غزل! کہاں ہو؟ چائے لے آؤ۔"

وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ تیزی سے چلتی ہوئی کچن میں آئی اور ایک دیگچی میں چائے کا پانی چڑھایا۔ حسب ضرورت چائے کی پتی اور چینی ڈالی۔ چولھا جلایا پھر دھیمی آنچ پر رکھ کر واپس وہیں ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس آ گئی۔

اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ "جی نہیں' سکندر ہمارا قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ اس کے ابو کے دوست کا بیٹا تھا۔ دوستی اتنی گہری تھی کہ بھائی جیسا رشتہ ہو گیا تھا۔ بے چارے وہ دوست بھی اب نہ رہے۔"

ہمنوا نے کہا۔ "پھر تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اس کے چالیسویں کا انتظار کرنا ضروری نہیں ہے۔ ایسی پابندیاں سگے رشتے داروں کے سلسلے میں ہوتی ہیں۔ میں کل ہی نواب صاحب کو اسپتال میں لے آؤں گا۔ وہاں آپ کے خاوند سے ملاقات ہو جائے گی۔ نواب صاحب اتنے نفیس انسان ہیں کہ آپ دونوں پہلی ملاقات میں ان سے متاثر ہو جائیں گے۔ وہ ایسے معاملات طے کرتے ہیں کہ آپ رشتے کے لئے ہاں کر دیں گی۔ پھر جب ہاں ہو جائے۔ تو شادی ایک ہفتے کے اندر ہو سکتی ہے۔"

غزل کو شادی کی بات زہر لگ رہی تھی۔ ان کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ چالیس دن تک بھی انتظار نہیں کریں گے۔ ٹھیک ہے کہ دوسروں کو اس سے ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ تو سوگ منانا چاہتی تھی۔ دنیا کی کوئی خوشی اسے گوارا نہیں تھی۔

اس نے دروازے پر آکر اپنی امی اور ہمنوا کو دیکھا پھر کہا۔ "امی! میں آپ کے اور ابو کے فیصلے کے آگے سر جھکاؤں گی لیکن اتنی جلدی نہیں۔ چالیس دنوں کے بعد۔"

وہ جواب سنے بغیر پلٹ کر چلی گئی۔ چولھے پر چائے چڑھی ہوئی تھی۔ وہ اُبل رہی تھی۔ یہ ابل چکی تھی۔ ناگواری سے زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

اس کی امی اور ہمنوا کو چپ لگ گئی تھی۔ پھر وہ بے بسی سے بولے۔ "میں تو آپ کے مسائل حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔"

وہ بولیں۔ "یہ بہت ضدی ہے۔ اعتراض کر چکی ہے' اب چالیس دن سے پہلے ہاں نہیں کرے گی۔"

"آپ ایسا کریں۔ اسے یہاں بھیج دیں۔ میں تنہائی میں سمجھاؤں گا۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد غزل ایک کپ چائے لے کر آئی۔ پیالی ان کے سامنے رکھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔ "چائے گرم ہے۔ یہ ذرا ٹھنڈی ہوگی تو حلق سے اترے گی۔ تم بھی ذرا ٹھنڈی ہو جاؤ پھر میری بات تمہاری سمجھ میں آسکے گی۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں نے غصے سے اعتراض نہیں کیا ہے۔ آپ بزرگوں کے فیصلے سے انکار نہیں ہے لیکن چالیس دن سے پہلے میرے لئے یہ قابلِ قبول نہیں ہے۔"

"تم دستور کے مطابق درست کہہ رہی ہو لیکن اپنے گھریلو حالات پر غور کرو۔ اپنے ابو کی بیماری کا خیال کرو۔ ان مسائل کا سامنا کرنے کے لئے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ تم ملازمت نہیں کر سکتیں کیونکہ وہاں رشتہ ہونے والا ہے۔ تمہاری امی اور ابو غیرت مند ہیں وہ کسی سے قرض بھی نہیں لیں گے۔"

وہ بولی۔ "کیا کیا جائے، عزت اور نیک نامی سے زندہ رہنے کے لئے خود داری اور غیرت مندی لازمی ہے۔ ہم مسائل جھیل رہے ہیں اور روتے بسورتے ہوئے تہذیبی روایات کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔"

ہمنوا نے کہا۔ "دانش مندی سے مسائل میں کمی کی جاسکتی ہے اور دانش مندی یہ ہوگی کہ جلد از جلد تمہاری شادی ہو جائے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ابھی کچھ نہ کہو۔ پہلے میری بات پوری سن لو، سمجھ لو پھر جواب دو۔ شادی کے معنی ہیں خوشی۔ میں مانتا ہوں چالیس دن تک خوشیاں نہیں منانی چاہئیں۔ یہاں ڈھولک نہیں بجے گی، گیت نہیں گائے جائیں گے۔ گھر کو سجایا نہیں جائے گا۔ لوگوں کو مرغن کھانے نہیں کھلائے جائیں گے۔ اگر شادی کے ایسے ہنگاموں کے بغیر خاموشی سے نکاح پڑھا دیا جائے تو؟"

وہ بولی۔ "نکاح خوشی سے قبول کیا جاتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں میں اس طرح اپنی خوشی ظاہر کروں۔"

"ہرگز نہیں۔ بعض دلہنیں حالات سے مجبور ہو کر زبردستی نکاح قبول کرتی ہیں۔ تم بھی خوشی سے نہ سہی حالات سے سمجھوتا کرنے کے لئے جبراً نکاح قبول کر سکتی ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "لیکن........"

انہوں نے پھر ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کہنے سے روک دیا اور کہا۔ "پہلے میری بات سن لو۔ صرف نکاح پڑھایا جائے گا۔ تمہاری رخصتی نہیں ہوگی۔ نواب صاحب بھی کوئی خوشی نہیں منائیں گے۔ اس نکاح کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اس گھر کے سرپرست بن جائیں گے۔ تم ایک شریکِ حیات کی حیثیت سے ان کی کمائی میں سے ایک مخصوص حصہ لینے کی حق دار بن جاؤ گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دل ہی دل میں تسلیم کرنے لگی کہ اس کے استاد ہمنوا اس کے تمام مسائل حل کرنے کے لئے اسے کسی نہ کسی طرح راضی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "اب میری باتوں پر اچھی طرح غور کرو۔ میں تمہارا استاد ہوں۔ تمہارا رہنما ہوں۔ تمہیں کسی غلط راستے پر نہیں ڈالوں گا۔"

وہ اپنے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ "آپ میرے بزرگ ہیں۔ میرے ابو کی جگہ ہیں۔ میں آپ کے فیصلے پر عمل کروں گی۔"

وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اتنی جدوجہد اتنی کشمکش کے بعد مسائل کا اونٹ ایک اچھی کروٹ بیٹھ گیا تھا۔ اس کی امی اور ہمنوا کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ کل صبح قرآن خوانی کے بعد وہ اسپتال آجائیں گے۔ ہمنوا، نواب سعداللہ جان کے ساتھ وہاں پہنچیں گے۔ وہاں تمام معاملات طے کرلئے جائیں گے۔

ہمنوا! وہاں سے سیدھے سعداللہ جان کی فیکٹری میں پہنچے۔ وہ انہیں دیکھ کر بولے۔

"خیریت تو ہے اچانک کیسے آگئے؟"

وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔ "بہت بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں۔"

وہ غزل اور اس کی امی سے ہونے والی تمام گفتگو سنانے لگے۔ سعداللہ جان کبھی بے چین ہو رہے تھے۔ کبھی خوش ہو رہے تھے۔ تمام باتیں سنانے کے بعد انہوں نے کہا۔

"یہ غزل بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ وہ مرنے والا جب اس کا قریبی عزیز نہیں ہے تو کیوں اس قدر سوگ منا رہی ہے؟"

"جناب! کوئی دور کا رشتے دار بھی ہو تو خاندان والے شادی بیاہ اور سالگرہ جیسی تقریبات منسوخ کر دیتے ہیں۔ غزل ایک سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ دستور کے مطابق درست کر رہی ہے۔"

"یہ سوچ کر ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے شریکِ حیات کے لئے ایک حسین اور ذہین لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ بڑی حکمت سے ہمیں منزل کے قریب لے جا رہے ہیں لیکن یہ ایک کڑوا گھونٹ ہے کہ صرف نکاح ہو رہا ہے اور ہم سہاگ رات کی خوشیاں نہیں منا سکیں گے۔"

"آپ وقتی طور پر یہ گھونٹ پی لیں۔ نکاح کے بعد ہی آپ ان کا معیارِ زندگی بدل دیں گے۔ ان کے طرزِ رہائش بدل جائے گی۔ ان کے سارے درد دور ہو جائیں گے۔ آپ غزل سے صبح شام ملتے رہیں گے تو وہ آپ کی عنایات سے اور آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر بے اختیار آپ کے قریب ہوتی چلی جائے گی۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولے۔ "ہماری کوشش یہی ہو گی۔ یہ ہمارے لئے ایک چیلنج بھی ہے کہ ہم چالیس دن سے پہلے گوہر مراد حاصل کر سکیں گے یا نہیں۔"

غزل اور سعداللہ جان ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بھی بن رہے تھے اور ایک دوسرے کو چیلنج بھی کر رہے تھے۔ یہ ہاتھ آ کر بھی ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی اور وہ پرانے پاپی تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے تھے۔ پتا نہیں وہ دونوں کس گھاٹ اترنے والے تھے۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق نواب سعداللہ جان ہمنوا کے ساتھ اسپتال پہنچ گئے۔ غزل کی امی اور ابو سے ان کا تعارف ہوا۔ سعداللہ جان نے کہا۔ "میں پہلے ہی آپ کی عیادت کے لئے آنا چاہتا تھا لیکن ہمنوا صاحب نے رائے دی کہ آپریشن کے بعد آپ کی طبیعت سنبھل جائے تو ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کا آپریشن کامیاب رہا ہے۔"

غزل کے ابو نے کہا۔ "آپ مجھ سے ملاقات کرنے آئے یہ میرے لئے ایسی خوشی کی بات ہے کہ میری آدھی بیماری دور ہو گئی ہے۔"

"سبحان اللہ! آپ ہمیں مسیحا کا مقام دے رہے ہیں۔"

ان کے درمیان پہلے رسمی طور پر گفتگو ہوتی رہی پھر وہ اصل موضوع پر آ گئے۔ سعداللہ جان نے کہا۔ "دو چار دنوں میں آپ اسپتال سے گھر آجائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری اونچی سماجی حیثیت کا خیال کریں۔ اس پسماندہ علاقے کو چھوڑ دیں۔ ہم

اپنی ایک کوٹھی غزل کے نام کروانے والے ہیں۔ وہ آپ کی اور آپ کی بیٹی کی ملکیت ہو گی۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ہماری باتوں سے اور ہمارے عمل سے آپ کی خود داری کو ٹھیس نہ پہنچے۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "ہم صحیح معنوں میں اس وقت خود دار کہلاتے جب ہمیں بیٹے کی کمائی نصیب ہوتی۔ بیٹے نافرمان ہو جائیں' اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ دنیا بسا لیں تو ہمارے جیسے بوڑھے والدین کو بیٹیوں کی محنت و مشقت اور ان کی کمائی پر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔"

ایک ڈاکٹر ان کا معائنہ کرنے آیا۔ سعداللہ جان نے پوچھا۔ "انہیں کب تک یہاں سے فارغ کیا جا سکے گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہیں۔ تین دنوں تک مسلسل پٹیاں کی جائیں گی۔ یہ چوتھے دن گھر جا سکتے ہیں۔ پھر ہر دوسرے تیسرے روز یہاں آ کر پٹیاں کرا سکتے ہیں۔ دوائیں باقاعدگی سے لیتے رہیں گے تو زخم جلد ہی بھر جائے گا۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد سعداللہ جان نے غزل کی امی سے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ اپنی بیٹی کی وہ کوٹھی دیکھ لیں۔ اس کی چابیاں رکھ لیں۔ اپنے گھر کا پرانا فرنیچر اور غیر ضروری سامان فروخت کر دیں یا ضرورت مندوں کو دے دیں۔ نئی کوٹھی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

غزل کے ابو نے سوچا۔ "اتنی جلدی یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے لیکن اس معاملے میں جلدی ضروری ہے۔ اگر ہم دیر کر دیں گے تو یہ اندیشہ ہے کہ غزل اپنا فیصلہ بدل سکتی ہے۔ وہ ذمہ دار اور سعادت مند لڑکی ہونے کے باوجود نادان ہے۔ پھر کسی کے جھانسے میں آ سکتی ہے۔ دانش مندی یہی ہے کہ اسے جلد سے جلد عزت آبرو کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔"

☆------☆------☆

وہ نئی کوٹھی میں آ گئے۔ زندگی ایک نئی ڈگر پر آ گئی۔ کوٹھی میں منتقل ہونے کے دوسرے دن اس کے ابو اسپتال سے آ گئے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ بیمار کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ فکر و پریشانیاں دور ہو جائیں' دل و دماغ سے بوجھ ہٹ جائے تو چہرے

سے سکون اور طمانیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اس کی امی اور ابو تمام عمر محنت اور مشقت سے حلال کی روزی حاصل کرتے رہے۔ تشویش ناک بیماریوں اور بدترین حالات کے باجود فاقے بھی کئے اور دواؤں کے بغیر بیماریوں کو ٹالتے بھی رہے لیکن کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ سو بیماریوں کی ایک بیماری بڑھاپا ہے۔ وہ بڑھاپے میں ایسا بیمار ہوئے کہ محنت و مشقت کے قابل نہ رہے۔ ایسے وقت جوان بیٹوں کا سہارا ہوتا ہے۔ گھر کی گرنے والی چھت کو سہارا دینے کے لئے نئے ستون کی اور بڑھاپے کو سہارا دینے کے لئے نئے خون کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان کا جوان بیٹا تھا' کماؤ پوت تھا۔ اپنا خون تھا' مگر سفید ہو گیا تھا۔ اپنے بیوی اور بچوں کو لے کر الگ رہنے لگا تھا۔ ایک پرائیوٹ کمپنی میں اعلیٰ عہدے دار تھا۔ بڑے لوگوں کے علاقے میں اسے رہائش کے لئے ایک بنگلہ دیا گیا تھا۔ وہ اپنے اونچے مقام سے کار میں بیٹھ کر والدین کے پسماندہ علاقے میں نہیں آسکتا تھا۔ ایک اعلیٰ عہدے دار کی شان و شوکت پر حرف آتا تھا۔

وہ کبھی دو چار مہینے میں دو چار سو روپے لا کر دیتا تھا۔ اس کے ابو نے صاف کہہ دیا تھا۔ "مجھے اپنے بیٹے کی کمائی چاہئے' بھیک نہیں چاہئے۔"

بیٹا مہنگائی کا اور محدود تنخواہ کا دکھڑا روتا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ "تمہارے بنگلے میں تمہارے ساس سسر اور سالے سالیاں آکر رہتے ہیں۔ اس وقت مہنگائی تمہیں نہیں رلاتی۔ تم دنیا کے پہلے بیٹے نہیں ہو۔ میں نے کتنے ہی گھروں میں دیکھا ہے تمہارے جیسے بے حس اور نافرمان بیٹے شادی کرتے ہی بیوی کے ساتھ الگ گھر بسا لیتے ہیں۔ وہ بوڑھے ماں باپ کو یا تو کبھی پوچھتے نہیں یا پھر ازراہ ہمدردی بھیک کے طور پر دو چار سو روپے لا کر پھینک دیتے ہیں۔"

یہ صرف ایک گھر کی روداد نہیں ہے۔ ایک محتاط سروے کے مطابق ستر فیصد گھرانے ایسے ہیں جہاں بیٹوں نے بوڑھے والدین کو چھوڑ دیا ہے اور جوان بیٹیاں ان کے بڑھاپے کا سہارا بنی ہوئی ہیں۔ وہ سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہیں۔ ملوں اور فیکٹریوں میں مزدوری کرتی ہیں۔ بڑے بڑے دفاتر میں بڑی بڑی ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ یوں عملی طور پر جہاد کرنے کے دوران میں اچھے بُرے مرد حضرات سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کچھ

لڑکیاں حالات سے مجبور ہو کر ہار جاتی ہیں' لیکن اکثر لڑکیاں اپنی تعلیمی صلاحیتوں سے اپنی ذہانت سے اپنی عزت اور اپنا عورت پن برقرار رکھتی ہیں۔

کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے والدین اور اپنے خاندان کی عزت اور نیک نامی کی خاطر بوڑھے دولت مندوں سے شادی کر لیتی ہیں۔ بیٹوں کی طرف سے ٹھکرائے ہوئے ماں باپ ایسی بیٹیوں کے ساتھ ان کے جہیز میں ان کے سسرال جاتے ہیں۔

بدترین معاشی حالات کے پیش نظر ایک بہت اہم سوال ابھرتا ہے۔ کیا بیٹیوں کی کمائی پر بڑھاپا گزارنے والے والدین کو بے غیرت کہا جا سکتا ہے؟

اگر کہا جا سکتا ہے تو پھر یہ بوڑھے کہاں جائیں؟

ان بوڑھوں کی شرافت اور خود داری کو قائم رکھنے کے لئے کوئی آبرو مندانہ قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ گویا یہ ملک اور قوم بے غیرت ہے جو ان بوڑھوں کے لئے بیٹیوں کی کمائی پر زندہ رہنے کا راستہ کھلا رکھتی ہے اور اپنے اختیارات اور ذرائع کے باقی تمام راستے بند کر دیتی ہے۔

☆======☆======☆

نثار احمد کار ڈرائیو کرتا ہوا پورچ میں آیا۔ کار کا ہارن سن کر نثار کی بیوی آسیہ اپنے بچوں کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ دونوں بچے دوڑتے ہوئے آکر باپ سے لپٹ گئے۔ آسیہ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر تازہ پھلوں سے بھرا ہوا شاپر اٹھایا۔ بچے باپ کو کس کرنے کے بعد پچھلی سیٹ پر آ گئے۔ وہاں ان کے لئے گفٹ پیکس رکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ڈیڈی ہر شام دفتر سے واپس آتے وقت ان کے لئے کھانے پینے اور کھیلنے کی چیزیں لے کر آتے ہیں۔

بڑی خوش حالی تھی۔ ماہانہ تنخواہ تو بارہ ہزار روپے تھی لیکن اوپری آمدنی اس سے زیادہ تھی۔ کمپنی کی طرف سے رہنے کے لئے بنگلہ دیا گیا تھا' لیکن سوسائٹی کے علاقے میں اپنی ایک ذاتی کوٹھی تعمیر کرائی جا رہی تھی۔ وہ چاہتا تو اپنی آمدنی میں سے کم از کم پانچ ہزار روپے ماہانہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو دے سکتا تھا۔ اس نے آسیہ سے کہا تھا۔ "یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں نے امی ابو کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ وہاں جوان بہن ہے' مجھے ہر ماہ کم از کم پانچ ہزار روپے دینے چاہئیں۔"

آسیہ نے کہا۔ ”آپ پانچ ہزار تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہ پانچ روپے ہوں۔ یہاں کھانے پینے کے بعد کوئی بچت نہیں ہو رہی ہے۔ اوپری آمدنی سے کوٹھی تیار ہو رہی ہے۔ مجھے یہ کمپنی کی کار ذرا اچھی نہیں لگتی۔ اپنی کار خریدنے کے لئے رقم بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اب اس میں سے پانچ ہزار انہیں دیں گے تو میری کار آ چکی۔“

وہ بیوی سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لڑنے جھگڑنے لگتی تھی۔ بچوں کو لے کر میکے چلی جاتی تھی۔ ایک تو وہ بیوی کا دیوانہ تھا بچوں کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا پھر دو ہٹے کٹے سالے تھے۔ ہیلتھ کلب میں پہلوانی کرتے تھے۔ وہ اس پر چڑھ دوڑتے تھے کہ وہ ان کی بہن پر ظلم کر رہا ہے۔

کچھ حالات نے، کچھ سسرال والوں کے دباؤ نے، کچھ اس کی اپنی خود غرضی نے اسے اپنی جوان بہن اور والدین سے دور کر دیا تھا۔ اس روز وہ دفتر سے واپس آیا تو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان دنوں کمپنی کے مالکان اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کی رشوت خوری پکڑی گئی تھی۔ اس سے جواب طلب کیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اپنی طرف سے صفائی پیش کرے اور یہ ثابت کرے کہ وہ مال کی خریداری میں ناجائز طور پر کمیشن نہیں لے رہا ہے اور ہر ماہ کمپنی کو ہزاروں روپے کا نقصان نہیں پہنچا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ صاف نہیں تھے۔ وہ صفائی پیش نہیں کر سکتا تھا پھر بھی جن سے مال کی خریداری ہوا کرتی تھی، ان سے اپنی سفارش کروا رہا تھا۔ امید تھی کہ اس کی غلطیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آ کر تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ آسیہ نے اس کے پیچھے آ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، آپ ملازمت کے سلسلے میں پریشان ہیں۔ میں تو نمازیں پڑھنے لگی ہوں۔ ہر نماز کے بعد دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ یہ کیس ختم ہو جائے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی ملازمت پر آنچ نہیں آئے گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں نے دوسری جگہ بھی درخواستیں دی ہیں۔ میری قابلیت اور میرا تجربہ ایسا ہے کہ کہیں نہ کہیں ملازمت مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے میری یہی ملازمت بحال ہو جائے۔ میں اس کے لئے فکر مند نہیں ہوں۔ بات کچھ اور ہے۔“

”اور ایسی کیا بات ہے؟ کیا پھر ماں باپ یاد آ رہے ہیں؟“

”یہاں سامنے آ کر بیٹھو۔ میں جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں، اسے سن کر تم یقین نہیں کرو گی۔“

وہ سامنے آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ”میں آپ کی ہر بات کا یقین کرتی ہوں، آپ بولیں۔“

”آج دوپہر کو آفس میں ابو کا فون آیا تھا۔“

آسیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”بڑے میاں کی بیماری تو ختم ہونے کو نہیں آ رہی ہے۔ پھر کچھ رقم کا مطالبہ کیا ہو گا۔“

”تم تو کچھ بولنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہو۔ پہلے میری بات تو سن لو۔ امی اور ابو سوسائٹی کی ایک کوٹھی میں رہنے لگے ہیں۔ وہاں غزل کی شادی ہونے والی ہے۔“

آسیہ نے پہلے تو بے یقینی سے اپنے میاں کو دیکھا پھر ایک دم سے قہقہہ لگانے لگی۔

وہ بولا۔ ”میں جانتا تھا تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ ان کے دن پھر گئے ہیں۔ وہ کوٹھی ان کی اپنی ہے اور اس کوٹھی کے گیراج میں جو کار کھڑی ہوئی ہے، اس کی قیمت بائیس لاکھ سے پچیس لاکھ تک ضرور ہو گی۔“

آسیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بے یقینی سے بولی۔ ”کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟“

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا ہے جب کہ میں آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ انہوں نے فون پر اس کوٹھی کا پتا بتایا اور کہا کہ غزل کی شادی طے کرنی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے کوئی مدد نہیں مانگیں گے۔ میں صرف باتیں کرنے کے لئے ان کے پاس چلا آؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسی کوٹھی میں کیوں بلا رہے ہیں؟ جب میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا تو ان کے رنگ ڈھنگ بدل چکے تھے۔ انہوں نے بہترین لباس پہنا ہوا تھا۔ ان کی خدمت کے لئے ملازم اور خادمائیں تھیں۔“

”آپ ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولیں۔ میرا دم اُلجھ رہا ہے۔ ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی؟ میں تو آٹھ دس لاکھ کی کار لینے کے لئے رقم جمع کر رہی ہوں اور وہاں پچیس لاکھ کی کار ہے پھر تو کوٹھی بھی دو تین کروڑ کی ہو گی۔“

”کوٹھی کے اندر جو قیمتی سامان ہے اسے دیکھ کر تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں۔ تم دیکھو گی تو بے ہوش ہو کر گر پڑو گی۔"

وہ بُری طرح پریشان ہو کر بولی۔ "آخر ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی؟ کیا کسی بینک میں ڈاکہ ڈالا ہے؟ اسمگلنگ کا دھندہ کرنے لگے ہیں۔ بیٹی کی دلالی کریں گے تب بھی اتنی رقم نہیں ملے گی۔"

وہ گرج کر بولا۔ "بکواس کرو گی تو منہ توڑ دوں گا۔ میرے ابو جیسا غیرت مند تمہارے پورے خاندان میں نہیں ہو گا۔ غزل کی شادی ایک رئیس ابن رئیس سے ہو رہی ہے۔ غزل کو یہ سب کچھ اس کے ہونے والے شوہر نے دیا ہے۔ کل وہ دلہن بننے والی ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہو گا۔"

وہ گم صم بیٹھی ہوئی اپنے میاں کا منہ تک رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ میری نند نے تو بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔ شادی سے پہلے اسے کار کوٹھی اور جانے کیا کچھ مل رہا ہے؟ شادی کے بعد پتا نہیں اور کتنی دولت مند ہو جائے گی۔

اس نے پوچھا۔ "امی ابو نے مجھے بھی بلایا ہے؟"

"وہاں شادی دھوم دھام سے نہیں ہو رہی ہے' کل صرف نکاح پڑھایا جائے گا۔ رخصتی بھی بعد میں ہو گی۔ ہم ان کے سگے ہیں اس لئے صرف ہمیں بلایا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ اب تو ان کی مخالفت سے باز آ جاؤ۔ وہ ہم سے کوئی رقم نہیں مانگ رہے ہیں۔ اب تو ان کے پاس اتنا ہے کہ وہ ہمیں دے سکتے ہیں۔"

"میں مخالفت نہیں کر رہی ہوں۔ دراصل ان کے سامنے جاتے ہوئے شرم آئے گی۔ میں ابو کی بیماری میں کبھی خیریت پوچھنے نہیں گئی ہوں۔ اب جاؤں گی تو وہ طعنے دیں گے۔"

"کوئی طعنے نہیں دے گا۔ انہوں نے امی اور غزل کو سمجھا دیا ہے۔ تم چلو گی تو وہ سب تمہیں گلے لگائیں گے۔ ہمیں آج رات کا کھانا بھی وہیں کھانا ہے۔ میں ان سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ تمہیں اور بچوں کو لے کر آؤں گا۔"

"جب وہ اتنے دولت مند ہو گئے ہیں تو پھر ان کے گھر ٹیلی فون ضرور ہو گا۔"

"ٹیلی فون بھی ہے اور موبائل بھی۔ تم ان سے باتیں کرو گی تو بہتر ہو گا۔ ان کے

سامنے جانے سے پہلے جھجک مٹ جائے گی۔

"کوٹھی میں دو فون ہیں۔ ایک ڈرائنگ روم میں ہے۔ ایک غزل کے بیڈ روم میں ہے پھر موبائل فون بھی ہے۔ میں ڈرائنگ روم کا نمبر ڈائل کر رہا ہوں۔"

اس نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد ریسیور کو کان سے لگا کر انتظار کیا' پھر کہا۔ "ہیلو! میں ہوں آپ کا بیٹا نثار احمد۔"

"ہاں بیٹے! بولو گھر پہنچ گئے۔"

"جی ہاں۔ میں گھر سے بول رہا ہوں۔ آسیہ میرے پاس بیٹھی ہیں۔ آپ لوگوں کی خوش حالی کے بارے میں سن کر بہت خوش ہو رہی ہے اور ابو میں نے کہا تھا ناکہ یہ شرمندہ بھی ہو گی تو یقین کریں یہ شرم سے رونے لگی ہے۔"

"اس سے میری بات کراؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔"

اس نے ریسیور آسیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اشارے سے کہا کہ وہ روتے ہوئے باتیں کرے۔

اس نے ریسیور کو کان سے لگا کر روہانسی آواز بنائی' پھر کہا۔ "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! کیسی ہو بیٹی؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک تو نہیں ہو۔ تمہاری آواز سے پتا چل رہا ہے کہ تم رو رہی ہو۔ بیٹی! تمہیں شرمندہ نہیں ہونا چاہئے۔ تم نے ہمیں بالکل ہی نظرانداز کر دیا۔ تم سے ایک بھول ہو گئی اور بھول کس سے نہیں ہوتی؟ ہم سے بھی ہو جاتی ہے۔ ہم تمہارے بزرگ ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ بچوں کی غلطیاں معاف کر دیا کریں اور ہم دل سے تمہیں معاف کر چکے ہیں۔ یہ لو اپنی ساس سے باتیں کرو۔"

تھوڑی دیر بعد ساس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو دلہن! کیسی ہو؟"

اس بار اسے سچ مچ رونا آ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نثار نے حیرانی سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف سے بولیں۔ "بیٹی! چپ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں دل سے معاف کر چکے ہیں۔ تم ہمارے گھر کی بہو ہو۔ ہمارے گھر کی عزت ہو۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ تم ابھی چلی آؤ۔ آ رہی ہو نا؟"

وہ روتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ”جی.......... جی ہاں۔“

”تم آؤ گی تو میں تمہیں واپس نہیں جانے دوں گی۔ کل غزل کا نکاح ہے۔ اپنی اور بچوں کی پوری تیاری کے ساتھ آنا۔ میں فون پر زیادہ بات نہیں کروں گی۔ بس ابھی سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔“

آسیہ نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ نثار نے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ تم سچ مچ رونے لگ گئی ہو۔“

وہ اس کے قریب آگئی۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر بولی۔ ”امی اور ابو نے اتنے پیار سے باتیں کیں جس کی میں توقع نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے پیار نے مجھے رُلا دیا۔“

”خدا کا شکر ہے۔ میرے ماں باپ کے لئے تمہارے دل میں محبت پیدا ہو رہی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”آپ ابھی اس کوٹھی سے آ رہے ہیں۔ آپ نے اسے اندر اور باہر سے دیکھا ہو گا۔ کیا وہ بہت بڑی کوٹھی ہے؟“

”بہت بڑی ہے اور بہت شاندار ہے۔ تم دیکھو گی تو دیکھتی رہ جاؤ گی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”پتا ہے امی کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کہہ رہی تھیں‘ میں اس گھر کی بہو ہوں۔ وہ گھر میرا ہے یعنی وہ اس کوٹھی کو میری کوٹھی کہہ رہی تھیں اور یہ تو ہونا ہی ہے۔ ایک نہ ایک دن سسرال کی ہر چیز بہو کی اور اس کے بچوں کی ہو جاتی ہے۔“

”سمجھ داری سے کام لیتی رہو گی تو ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کرتے رہیں گے۔ چلو اٹھو‘ فوراً چلنے کی تیاری کرو۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم میں آگئی پھر الماری سے ایک بڑی اٹیچی نکال کر اس میں کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھتے ہوئے بولی۔ ”امی نے کہا ہے۔ مجھے واپس نہیں آنے دیں گی۔ میں بھی انہیں اتنا پیار‘ اتنی توجہ دوں گی اور ایسی خدمت کروں گی کہ وہ مجھے کبھی اپنے سے الگ نہیں کریں گی پھر پوتے پوتی کے لئے تو وہ ویسے بھی تڑپتی ہیں۔ سمجھ لیں کہ اب ہمیں اس کوٹھی میں رہنا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں سامان

پیک کر رہی ہوں۔ آپ بچوں کو تیار کر دیں۔ دیر ہو رہی ہے۔“

بستر پر بہت سے ملبوسات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک لباس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یا اللہ! میں کون سا لباس پہنوں؟ میں بھول گئی امی کو کون سا رنگ پسند ہے؟ اب تو وہ جو پہننے کو کہیں گی۔ وہ پہنوں گی جو کھانے کو کہیں گی‘ وہ کھاؤں گی۔ وہاں نمازیں پڑھا کروں گی اور ان کے دل میں جگہ بناتی رہوں گی۔“

اب وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں ساس کو راضی رکھنے کے لئے عبادت گزار بننے والی تھی۔

☆======☆======☆

غزل دیکھ رہی تھی کہ اس کی امی اور ابو کو اس مہنگی کوٹھی میں آکر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ بیٹے اور بہو کے آنے سے ہو رہی تھی۔ وہ دونوں پوتے اور پوتی کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اس کی امی خانساماں کو بلا کر کہہ رہی تھیں۔ ”بھیا! آج کوئی اچھا چٹ پٹا مزے دار کھانا تیار کرو۔ میری بہو میرے پوتے پوتی کو لے کر آ رہی ہے۔ سمجھو کہ یہیں رہیں گی۔ بچوں کے لئے کچھ میٹھا بھی بنا لینا۔“

پھر انہوں نے ایک خادمہ سے کہا۔ ”اوپر والا ایک بیڈ روم کھول دو اور وہاں ضرورت کی ہر چیز رکھ دو۔ اچھی طرح صفائی کر دو۔ باتھ روم میں ٹھنڈے اور گرم پانی کی لائن دیکھ لو اور ائرکنڈیشن بھی چالو کر دو۔“

خادمہ حکم کی تعمیل کے لئے چلی گئی۔ غزل نے کہا۔ ”امی اسے ائرکنڈیشن نہیں ائرکنڈیشنر کہتے ہیں اور یہ بھی کہنا ضروری نہیں ہے صرف اے سی کہہ دیا کریں۔“

اس کے ابو نے کہا۔ ”اور یہ چالو کرنا کیا ہوتا ہے۔ تم جس محلے سے آئی ہو وہاں کی زبان بھول جاؤ۔ ذرا سنبھل کر بولا کرو۔ یہ نوکر چاکر کیا سوچیں گے؟“

وہ بولیں۔ ”خوشی کے مارے میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے‘ میں کیا بول رہی ہوں؟ اور کیا سن رہی ہوں؟ جب تک میرا بیٹا دونوں بچوں کو لے کر نہیں آئے گا‘ میرے حواس ٹھکانے نہیں آئیں گے۔“

غزل نے ناگواری سے پوچھا۔ ”امی! دنیا کے تمام ماں باپ بیٹوں کی تمنا کیوں کرتے ہیں؟ کیا دیتے ہیں یہ بیٹے؟ ابو آپ بھی بہت خوش ہیں‘ ان کے لئے بہت بے چین نظر آ رہے ہیں۔“

وہ ذرا جھینپ کر بولے۔ "وہ......... بات یہ ہے کہ بیٹے سے نسل آگے بڑھتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اور پوتے ہوں گے پھر وہ پوتے جوان ہوں گے' ان سے اولادیں ہوں گی۔ خاندانی شجرے میں میرا نام ہو گا کہ میں ان کا باپ دادا پردادا ہوں۔ انسان مرجاتا ہے لیکن بیٹوں کی اولاد کے ذریعے اس دنیا میں اس کا نام باقی رہتا ہے۔"

وہ بولی۔ "کیا شجرے میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ بیٹے کس قدر خود غرض اور نافرمان ہوتے ہیں؟ وہ باپ کے کمائے ہوئے پانچ ہزار روپے میں بھی بے ایمانی کرتے ہیں۔ بیمار باپ کو دو ہزار روپے دیتے ہیں اور تین ہزار چرا کر لے جاتے ہیں۔ جب وہ اپنے گھر میں مرغن کھاتے رہے تو آپ دونوں فاقے کر رہے تھے۔ آپ بیمار رہے کبھی آپ کی دوا اور علاج کے لئے ہزار روپے بھی نہیں دیئے۔"

اس کی امی نے کہا۔ "بیٹی کیوں گڑے مُردے اکھاڑ رہی ہو؟ ہمارے بیٹے سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ اب اس کی بھول کو ہم معاف نہیں کریں گے تو خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔"

"آپ بھول رہی ہیں؟ بھائی جان نے بھول نہیں کی' بہت بڑا جرم کیا ہے۔ ابو کو موت کے دروازے تک پہنچایا۔ خدانخواستہ ابو کو کچھ ہو جاتا تب بھی آپ بیٹے کو باپ کا قاتل کبھی نہ کہتیں اور ابو! خدانخواستہ آپ جان سے چلے جاتے تو قیامت کے دن بھی بیٹے کا گریبان پکڑ کر اسے قاتل نہ کہتے کیونکہ بیٹا قاتل ہونے کے باوجود ولدیت میں آپ کا نام لکھتا رہتا اور مقتول باپ کے نام سے پہچانا جاتا رہتا۔"

"خدا کے لئے ہمیں شرمندہ نہ کرو۔ بزرگ اتنے فراخ دل ہوتے ہیں کہ اپنے بچوں کی بڑی بڑی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں۔ بیٹا سر جھکا کر اپنی غلطیاں تسلیم کر چکا ہے۔ وہ یہاں بیٹھ کر ہم سے معافیاں مانگتا رہا ہے۔ اسے صبح کا بھولا سمجھ کر معاف کر دینا چاہئے۔"

اس کی امی نے کہا۔ "تم نہیں جانتیں۔ آسیہ فون پر بلک بلک کر رو رہی تھی۔"

"خوب جانتی ہوں۔ مگرمچھ کے آنسو پہچانتی ہوں۔ آپ دونوں موم کے بنے ہوئے ہیں جو ذرا سی آگ دکھا کر جدھر موڑ دیتا ہے' اُدھر مڑ جاتے ہو۔"

"بیٹی! تم کیا چاہتی ہو؟ کیا انہیں گلے نہ لگایا جائے؟"

"آپ انہیں ضرور گلے لگائیں لیکن زیادہ منہ نہ لگائیں۔ اندر سے ان کے لئے محبت رکھیں لیکن اوپر سے سخت رہیں۔ انہیں یہ احساس دلاتے رہیں کہ وہ خود غرض تھے۔ خدانخواستہ ہم پر پھر زوال آئے گا۔ ہم پھر کسی پسماندہ علاقے میں پہنچ جائیں گے تو ان کی خود غرضی پھر انہیں ہم سے دور لے جائے گی۔"

اس کی امی نے عاجزی سے کہا۔ "وہ اتنے دنوں بعد ہمارے سامنے جھک رہا ہے۔ تمہیں اپنے بھائی سے بہت سی شکایتیں ہیں مگر ہماری خاطر معاف کر دو۔ وہ سیدھے راستے پر آگیا ہے۔"

"وہ واقعی سیدھے راستے پر آچکے ہیں یا نہیں۔ یہ آپ کو آزمانا چاہئے۔"

اس کے ابو نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟ اسے کس طرح آزمایا جائے؟"

وہ بولی۔ "ان سے دن رات کی دوستی نہ رکھی جائے۔ وہ صبح یہاں ملنے آئیں تو شام کو ضرور واپس چلے جائیں۔ اس گھر سے کچھ لے جانا چاہیں تو صاف کہہ دیں کہ یہ تمہاری بہن کا گھر ہے اور ایک غیرت مند بھائی بہن کو دیتا ہے' بہن سے لیتا نہیں ہے۔ اس طرح لین دین کا سلسلہ نہیں رہے گا۔ اس گھر سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا تو آپ دیکھیں گے کہ وہ پھر بے مروت اور خود غرض بن جائیں گے۔"

اس کی امی نے کہا۔ "بیٹی اسے اس قدر غلط نہ سمجھو۔ وہ بے مروت نہیں ہے ایسا کبھی نہیں کرے گا۔"

"سانچ کو کیا آنچ؟ آپ میرے مشوروں پر عمل کریں۔ جلد ہی ان کی اصلیت سامنے آجائے گی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ہماری ایک پوتی ہے۔ ایک پوتا ہے۔ وہ ہم سے کچھ مانگیں گے تو کیا ہم انکار کر دیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔ وہ معصوم بچے ہیں۔ وہ باپ کے فریب کو اور دادا کی شرافت کو نہیں سمجھتے ہیں۔ آپ انہیں مہنگے سے مہنگے کھلونے خرید کر دیں۔ ان کے کھانے اور کپڑوں پر بے تحاشا رقم خرچ کر دیں لیکن بھائی اور بھابی جان کو ایک روپیہ بھی نہ دیں۔ اگر انہیں واقعی آپ سے دلی لگاؤ ہو گا تو وہ رقم نہ ملنے کے باوجود آپ کے قدموں میں آکر جھکتے رہیں گے۔ ویسے آپ میری یہ بات گرہ میں باندھ لیں۔ جب بھابی کو ہم سے کوئی فائدہ

نہیں پہنچے گا تو وہ اپنے اشاروں پر ناچنے والے میاں کو پھر ماں کی جنت سے دور لے جائے گی۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "بیٹی! میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اور تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہم بیٹے اور بہو کو بھرپور محبتیں دیں گے لیکن ان سے کوئی لین دین نہیں رکھیں گے۔ میں تمہاری صرف ایک بات سے متفق نہیں ہوں کہ ان سے صرف دن کے تعلقات رکھے جائیں۔ نہیں بیٹے! وہ رہنا چاہیں تو انہیں دن رات ہمارے ساتھ رہنے دو۔ اس طرح وہ دو معصوم بچے ہم سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتے رہیں گے۔"

"جب آپ میری تمام باتوں سے متفق ہیں تو میں بھی آپ کی اس بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ وہ یہاں دن رات رہ سکتے ہیں۔ آپ انہیں اوپری منزل کا کمرہ نہ دیں۔ وہاں میں تنہا رہنا چاہوں گی۔"

موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے وہاں سے اٹھ کر جاتے ہوئے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا اور پھر کہا۔ "ہیلو!" وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف نواب سعد اللہ جان ہوں گے۔ انہوں نے ذاتی معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے اسے وہ موبائل فون دیا تھا۔"

اس کے خیال کے مطابق دوسری طرف سے سعد اللہ جان کی آواز سنائی دی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر اپنے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے سن رہی تھی۔ "ہیلو! ہم ہیں نواب سعد اللہ جان۔"

"السلام علیکم!"

انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر پوچھا۔ "ہم نے آپ کی کسی مصروفیت میں مداخلت تو نہیں کی ہے؟"

"میری مصروفیات بھلا کیا ہونے لگیں؟ پہلے مسائل تھے۔ فکر اور پریشانیاں تھیں۔ آپ نے ان سب سے نجات دلا دی ہے۔ اب تو سوچنے اور فکر کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"خدارا اسے احسان کا نام نہ دو۔ ہم نے جو کیا ہے' آپ کی محبت سے سرشار ہو کر کیا ہے۔"

اسے سعد اللہ جان کی زبان سے محبت کا لفظ اچھا نہیں لگا۔ یہ لفظ صرف سکندر کے

لئے مخصوص تھا۔ اس نے اپنے وجود کے تمام جملہ حقوق اس کے نام کئے تھے۔ اب وہ نہیں رہا تھا۔ وہ مر چکا تھا لیکن محبت تو کبھی نہیں مرتی۔ وہ اپنا وجود نواب صاحب کو دینے والی تھی لیکن محبت نہیں دے سکتی۔

ان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "آپ چپ ہو گئی ہیں۔ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"جی........ کچھ نہیں۔ آپ کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔"

"ہم نے محبت کا اظہار کیا تھا۔ آپ نے محبت سے جواب نہیں دیا۔"

"نواب صاحب! آپ خیال نہ کریں۔ شرم و حیا کا تقاضا ہے کہ شادی سے پہلے کسی غیر کا تصور بھی نہ کیا جائے۔ محبت تو دور کی بات ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولے۔ "سبحان اللہ۔ آپ کتنے پاکیزہ خیالات رکھتی ہیں۔"

اسے ندامت سی ہوئی۔ اس کے ضمیر نے کہا کہ وہ پاکیزہ نہیں ہے۔ اپنے ہونے والے مجازی خدا سے جھوٹ بول رہی ہے۔ دھوکا دے رہی ہے۔ اس نے فی الوقت ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "کل مغرب کی نماز کے بعد ہمارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ ہم ابھی سے فخر کر رہے ہیں کہ ایک اچھوتی اور پاکباز شریف زادی ہماری شریکِ حیات بننے والی ہے۔ آپ شریکِ حیات بننے کے بعد ہم سے پیار و محبت کی باتیں کریں گی؟"

اس نے اقرار نہیں کیا۔ بات بنائی۔ "پلیز نواب صاحب! مجھے ایسی باتوں سے شرم آتی ہے۔"

پھر اس نے ایک طرف منہ گھما کر بلند آواز سے کہا۔ "جی امی! آ رہی ہوں۔"

وہ فون پر بولی۔ "معذرت چاہتی ہوں۔ امی بلا رہی ہیں۔ آپ اجازت دیں گے؟"

"بے شک........ بے شک........ ہم پھر کسی وقت گفتگو کریں گے۔"

غزل نے۔ "اللہ حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا۔ اطمینان کی گہری سانس لی پھر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔ زینے کے نیچے اس کی امی کھڑی کہہ رہی تھیں۔

"اے بیٹی! میں نے تو آواز نہیں دی؟"

وہ تعجب سے بولی۔ "آپ نے آواز نہیں دی؟ پھر تو میرے کان بج رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے آپ نے پکارا ہے۔"

وہ زینے سے اترتی ہوئی نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ ماں باپ جانتے تھے کہ وہ موبائل فون صرف نواب صاحب سے گفتگو کرنے کے لئے مخصوص تھا اور ابھی وہ اوپر جا کر ان ہی سے باتیں کر رہی تھی پھر جانے کیا بات ہوئی کہ اس نے ماں کو مخاطب کر کے فون بند کر دیا۔ ماں نے تو اسے آواز نہیں دی تھی۔ شاید اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی ہو گی۔

اس کی امی نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "بیٹی! نواب صاحب کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ وہ تم سے باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ کم از کم ان کا دل رکھنے کے لئے باتیں کر لیا کرو۔"

"آپ شکایت کیوں کر رہی ہیں؟ انہوں نے آپ سے میری شکایت کی ہے؟ کیا میں ابھی ان سے باتیں نہیں کر رہی تھی؟"

"باتیں کر رہی تھیں لیکن مجبور ہو کر۔ کیا میں نادان ہوں؟ سمجھتی نہیں ہوں کہ تم نے مجھے آواز دے کر فون بند کیا ہے۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "بیٹی اپنے باپ کی ایک بات مان لو۔ اپنے کسی بھی رویئے سے نواب صاحب کو یہ تاثر نہ دو کہ یہ شادی تمہاری پسند اور تمہارے مزاج کے خلاف ہو رہی ہے۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ "ہمارے بڑھاپے کی لاٹھی بن رہی ہو تو مضبوط بنو۔ ذرا چل کر ٹوٹ جاؤ گی تو ہم اوندھے منہ گریں گے۔"

وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ان سے لگ کر ان کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔ "ابو! میں آپ کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ بے خیالی میں ایسا ہو جاتا ہے۔ میں خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ "تم بہت سعادت مند ہو۔ کاش یہ سعادت مندی بیٹے میں ہوتی! وہ ہمیں ساتھ لے کر چلتا تو تم ہماری خاطر اپنے مزاج کے خلاف فیصلہ نہ کرتیں۔"

"دنیا میں بے شمار لڑکیوں کی شادیاں ان کے مزاج کے خلاف ہوتی ہیں۔ بعد میں وہ اپنے شوہروں کے مزاج میں ڈھل جاتی ہیں۔ مطمئن ہو کر زندگی گزارتی ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، میرا مزاج بھی بدل جائے گا۔"

باہر کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس کی امی نے خوش ہو کر کہا۔ "میرا نثار آ گیا۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف جانے لگیں۔ اس کے ابو نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بھائی اور بھاوج سے بڑی شکایتیں ہیں پھر بھی بیٹی! ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ۔ دوسروں کا ظرف نہ دیکھو۔ اپنی اعلیٰ ظرفی پر قائم رہو۔"

وہ دونوں بیرونی دروازے کو کھول کر باہر آئے۔ وہاں ساس بہو گلے مل کر رو رہی تھیں۔ اس کے ابو نے پوتی کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔ اسے پیار کیا پھر جھک کر پوتے کو پیار کیا۔ غزل نے بھائی کو سلام کیا۔ اس کے ابو بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "بیٹی! آنسو پونچھو اور گھر میں چلو۔ ہم بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

بہو نے ساس سے الگ ہو کر اپنی نند کو دیکھا۔ وہ چاہتی تھی کہ غزل آگے بڑھ کر اسے گلے لگائے' لیکن اس نے دور ہی سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آئیں.......... اندر آجائیں.........."

وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ آسیہ نے نثار کو دیکھا۔ دونوں نے اس کی بے رخی کو بھانپ لیا۔ نثار نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "آسیہ! میں نہ کہتا تھا' امی اور ابو سے تمہیں بہت پیار ملے گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اندر آئے۔ اس کی امی نے کہا۔ "یہ ہماری بہو ہے۔ ہمارے گھر کی عزت ہے۔ اسے پیار ہی پیار ملے گا۔ اس کے پیار میں تو مجھے پوتے پوتی کو پیار کرنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ وہ دونوں بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر پیار کرنے لگیں۔ ان بوڑھوں کو جیسے جنت مل گئی تھی۔ بیٹا' بہو اور ان سے ہونے والی اولادیں گھر کو جنت بنا دیتی ہیں۔ بیٹی ذات کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پرائی ہوتی ہیں۔ وہ ماں باپ کو چھوڑ کر پرائے گھر کو جنت بناتی ہیں لیکن فی زمانہ اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ بیٹیوں کے دم قدم سے والدین کو جیتے جی جنت نصیب ہوتی رہتی ہے۔

غزل سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ آسیہ نے اپنی ساس سے کہا۔ "امی! غزل ناراض ہے۔ ہمارے آنے سے خوش نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ زیادہ نہیں رہیں اس لئے اس کے مزاج کو نہیں سمجھتی ہو۔ وہ تنہائی پسند ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرو۔ وہ اسی طرح خاموش اور سنجیدہ سی رہتی ہے۔"

اس کے ابو نے نثار سے پوچھا۔ "اور بیٹے! کام کیسا چل رہا ہے؟"

"آپ کی دعا ہے ابو ٹھیک ہی چل رہا ہے۔"

آسیہ نے کہا۔ "کہاں ٹھیک چل رہا ہے۔ آپ ابو سے کیوں چھپا رہے ہیں؟ کیا اپنوں سے پریشانیاں چھپائی جاتی ہیں؟"

ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹا؟ تم پریشان ہو؟ کیا پریشانی ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ بات یہ ہے کہ بس وہ دفتری معاملات ہیں۔ اب میں کیا بتاؤں۔"

آسیہ نے کہا۔ "اس کمپنی میں ان کا ایک آفیسران کی مخالفت کر رہا ہے۔ ان پر فراڈ کا جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ انہیں صفائی پیش کرنے کے لئے ایک ہفتے کی مہلت دی گئی ہے۔ اعلیٰ افسران مطمئن نہ ہوئے تو انہیں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔"

ماں نے کہا۔ "ہائے اللہ! تمہاری ملازمت نہیں رہے گی؟ تمہارے دشمن کہاں سے پیدا ہو گئے ہیں؟ ایسے حسد کرنے اور جلنے والوں پر خدا کی مار۔ کیا تمہاری ملازمت نہیں رہے گی؟"

باپ نے پوچھا۔ "سچ بتاؤ بیٹے! تم نے کوئی فراڈ کیا ہے؟"

بیٹے سے پہلے ماں نے کہا۔ "کیا یہ جھوٹا مکار دکھائی دیتا ہے؟ اپنے خون سے ایسا سوال کر رہے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی سے دھوکا نہیں کیا۔ کبھی حرام کی کمائی گھر نہیں لائے۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔"

نثار نے کہا۔ "امی! کسی کے کیچڑ اچھالنے سے میں میلا نہیں ہو جاؤں گا۔ میں نے کئی جگہ ملازمت کی درخواستیں دی ہیں۔ ایک ملازمت جائے گی تو دوسری کہیں مل جائے گی۔ میں ہنرمند اور تجربہ کار ہوں۔ زیادہ عرصے تک بے روزگار نہیں رہوں گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹے کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے' بہتری کے لئے کرتا ہے۔ فکر نہ کرو۔ میں جو ہوں۔ تمہیں پریشان

نہیں ہونے دوں گی۔"

ایک ملازم چائے اور ناشتے کی ٹرالی لے کر آیا۔ وہ سب کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ دادی اور دادا اپنے پوتے پوتی کو بڑے پیار سے کھلا رہے تھے۔ نثار نے زینے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میری بہن مجھ سے دور ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے منانا چاہتا ہوں۔"

اس کی امی نے اس کے ابو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "شاید آرام کر رہی ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

انہوں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر ایک بٹن کو دبایا۔ دوسری طرف سے غزل نے پوچھا۔ "کون.........."

"بیٹی! میں ہوں' کیا آرام کر رہی ہو؟"

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں ابو؟"

"یہ تمہارے بھائی جان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ انہیں میرے کمرے میں بھیج دیں۔"

انہوں نے ریسور رکھ کر نثار سے کہا۔ "وہ اپنے بیڈ روم میں ہے۔ تم جا کر مل لو۔"

وہ جانے کے لئے اٹھا تو آسیہ نے کہا۔ "میں بھی چلوں؟"

نثار نے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ماں نے کہا۔ "ہاں ہاں' تم بھی جاؤ۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے والا کمرا ہے۔"

ان کے پوتے زبیر نے کہا۔ "ہم بھی جائیں گے۔"

آسیہ نے کہا۔ "نہیں بیٹے! دادی جان کے پاس رہو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

وہ دونوں وہاں سے چلتے ہوئے زینے کے پاس آئے۔ آسیہ نے زینے پر چڑھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "آپ کی بہن تو وی آئی پی بن گئی ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس اوپری حصے میں نہیں آتا ہے۔"

اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ "غزل کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ اسے کسی طرح موم کرو۔"

"کوشش کروں گی۔ اس کے طعنے بھی برداشت کروں گی۔ جھکنے سے کام بنے گا تو

جھکنے کی انتہا کر دوں گی۔"

انہوں نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ غزل کی آواز سنائی دی۔ "آجائیں۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر آئے۔ اس کے بیڈروم کی سجاوٹ اور وہاں کا قیمتی آرائشی سامان دیکھ کر آسیہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بے اختیار بول پڑی۔ "او گاڈ! اتنا خوب صورت بیڈروم تو میں کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ غزل! تم بڑی سمجھ داری سے اپنا مقدر بنا رہی ہو۔"

غزل نے بھائی کو دیکھ کر کہا۔ "یہ بھائی جان کی مہربانی ہے۔ یہ ہمیں بے سہارا نہ چھوڑتے تو میں تجربات کی آگ میں جل کر کندن نہ بنتی۔"

نثار نے جھینپ کر کہا۔ "میری بہن! طعنے نہ دو۔ کیا بڑے بھائی کی ایک غلطی معاف نہیں کرو گی؟"

"آپ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ معافی مانگ کر چھوٹی بہن کو بھی شرمندہ کر رہے ہیں۔"

آسیہ نے کہا۔ "تمہاری ناراضگی درست ہے لیکن جب بڑے شرمندہ ہوں تو انہیں اور شرمندہ نہیں کرنا چاہیئے۔"

"آپ دونوں معافی نہ مانگیں تو کوئی کسی سے نادم نہیں ہو گا۔ میں پچھلی تمام باتیں بھول رہی ہوں۔ آپ کھڑے کیوں ہیں۔ آرام سے بیٹھ جائیں۔"

وہ دونوں اس کے سامنے ایسے ادب سے بیٹھے جیسے کسی بزرگ یا معزز ہستی کے سامنے بیٹھ رہے ہوں۔ آسیہ نے کہا۔ "تم بہت فراخ دل ہو۔ پچھلی باتیں بھول رہی ہو، ہم آئندہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔"

وہ بولی۔ "پہلے ہم بھائی جان پر بوجھ تھے۔ آئندہ ہم ایک دوسرے کا بوجھ نہیں بنیں گے تو پھر کبھی کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہو گی۔ آپ کی طرح ہمارا بھی گھر ہو گیا ہے۔ ہم اپنے اپنے گھروں میں رہ کر کھاتے پیتے رہیں گے تو ایک دوسرے کے لئے کبھی مسئلہ نہیں بنیں گے۔"

آسیہ اور نثار نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھا۔ غزل نے کہا۔ "میں زینے پر کھڑی سن رہی تھی۔ بھائی جان کی ملازمت ختم ہونے والی ہے۔ آپ دونوں

نواب سعد اللہ جان کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ بہت خوددار اور غیرت مند ہیں۔ کبھی کسی سے کسی طرح کی مدد قبول نہیں کرتے اور مدد مانگنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان سے رشتے داری ہو رہی ہے۔ ہم سب کو بھی ان کی طرح خوددار اور غیرت مند بن کر رہنا ہو گا۔"

ان کے چہرے اتر گئے۔ بھائی نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم تمہارے سسرال والوں سے کبھی کمتر بن کر نہیں رہیں گے۔ ہم بھی خاندانی لوگ ہیں۔"

آسیہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال یہ پریشانی ہے کہ ملازمت ختم ہو گئی تو وہ بنگلہ چھوڑنا پڑے گا۔"

وہ بولی۔ "پریشانی تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ آپ کے میکے میں بڑی گنجائش ہے۔ بھائی جان وہاں ہفتوں جا کر رہتے ہیں۔ نئی ملازمت ملنے تک وہاں گزارا ہو جائے گا۔"

نثار نے کہا۔ "کبھی دو چار دنوں کے لئے وہاں چلا جاتا ہوں۔ سسرال میں مستقل نہیں رہنا چاہیئے۔"

"واقعی! آپ کو ساس سسر کے پاس نہیں رہنا چاہیئے۔ بڑی مشکل ہے۔ بہن کے گھر میں بھی غیرت کا مسئلہ پیدا ہو گا۔ آپ کو تو کرائے کا کوئی مکان تلاش کرنا ہو گا۔"

ان دونوں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

☆------☆------☆

دوسرے دن شام کو خاموش برات آئی۔ نہ ڈھول باجوں کا شور تھا اور نہ ہی دوست احباب کو مدعو کیا گیا تھا۔ دوستوں میں صرف ہمنوا تھے۔ رشتے داروں میں ان کے بھائی اسداللہ جان اور اس کے بیوی بچے آئے تھے۔ ماہ لقا اپاہج ہونے کے باعث نہ آسکیں۔ جی تو بہت چاہ رہا تھا کہ سوتن کو جا کر دیکھیں اور موازنہ کریں کہ وہ نئی نویلی دلہن ان سے کس حد تک بہتر ہے۔

دیکھنا ضروری نہیں تھا۔ بیگم ماہ لقا کو عقل سمجھا رہی تھی کہ وہ باسی ہو چکی ہیں۔ آنے والی کم سن ہے۔ جوان ہے اگر بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہوگی تب بھی باسی کے مقابلے میں تازہ گلاب دکھائی دے گی۔

ان کی دوسری بہن مہوش کو دلہن دیکھنے کی سب سے زیادہ بے چینی تھی۔ وہ نئی دلہن کے مزاج کو سمجھنا چاہتی تھی کہ وہ آنے والی نرم اور ٹھنڈے مزاج کی ہوگی تو وہ نواب صاحب کی کوٹھی میں بچوں سمیت اس کی رہائش پر اعتراض نہیں کرے گی۔ اسداللہ اور اس کی بیگم کو بھی یہی تشویش تھی۔ وہ بھی دلہن کو دیکھتے ہی یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ آئندہ نواب صاحب کی کوٹھی میں ان کا گزارا ہوگا یا نہیں۔

نکاح ایک ضمانت ہے کہ میاں بیوی مستقبل میں ایک خوش گوار زندگی گزاریں گے لیکن اس شام جو نکاح ہو رہا تھا' وہ نواب صاحب کے بھائی اسداللہ اور اس کی بیگم کے لئے دوسری طرف غزل کے بھائی اور بھاوج کے لئے بہت اہم تھا۔ وہ سارے عزیز و اقارب اس بات کی ضمانت چاہتے تھے کہ اس نکاح کے بعد وہ پہلے کی طرح خوشگوار زندگی گزار سکیں گے۔

غزل کو ایک مہنگے بیوٹی پارلر سے دلہن بنا کر لایا گیا تھا۔ مہوش اور اسداللہ کی بیگم

نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئیں۔ اس کے سامنے ماہ لقا کا چراغ بجھ گیا تھا۔ وہ سب اس پر صدقے واری ہونے لگیں' اس کی تعریفیں کرنے لگیں۔ آسیہ نے بڑے فخر سے کہا۔ "یہ میری ایک ہی نند ہے۔ آپ لوگوں نے اس سے پہلے اتنی حسین دلہن نہیں دیکھی ہوگی۔"

مغرب کی نماز کے بعد نکاح پڑھایا گیا۔ قاضی صاحب نکاح پڑھانے کے لئے غزل کے پاس آئے تو اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ سکندر اس کے بدن کی روئیں روئیں چھو رہا تھا۔ اس دنیا میں نہ ہونے کے باوجود اس کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ ان لمحات میں اس پر ایک بے خودی سی طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قاضی صاحب اس کے کانوں میں سکندر کا نام پھونک رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں۔ "تم اسی کے لئے پیدا ہوئی ہو' تمہیں اس سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ کیا تمہیں قبول ہے؟"

وہ بڑے جذبوں سے بولی۔ "قبول ہے۔"

اس کے سامنے نکاح نامہ رکھا گیا۔ اس سے کہا گیا۔ "یہاں دستخط کرو۔"

آسیہ نے قلم لے کر کہا۔ "اسے پکڑو اور دستخط کرو۔"

وہ قبولیت کے جذبوں میں ڈوبی ہوئی تھی' بہتی جا رہی تھی۔ بے خودی کا ایک عالم تھا۔ آسیہ نے اس کے شانے کو ذرا سا جھنجوڑا تو وہ ایک دم سے چونک گئی۔ آسیہ ذرا گھونگٹ اٹھا کر جھانکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "جب نکاح قبول کر چکی ہو تو دستخط کرنے سے کیوں شرما رہی ہو۔ یہ قلم پکڑو۔"

اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ اس نے جھک کر دستخط کئے۔ ہائے! کس نام سے منسوب ہو کر قبول کیا اور کس نام سے منسوب ہو کر دستخط کر رہی تھی۔

سب نے مبارک باد دی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی اور نواب سعداللہ جان ڈرائنگ روم میں مردوں کے درمیان تھے۔ ہمنوا نے ان کے گلے لگ کر مبارک باد دیتے ہوئے کانوں میں سرگوشی کی۔ "بندہ پرور! آپ نے پہاڑ جیسی ذمے داری سونپی تھی۔ ہم وہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر آپ تک لے آئے ہیں۔"

وہ بولے۔ "بے شک! آپ نے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ ہم آپ کو خوش کر دیں گے۔"

مختصر سے براتیوں میں مصری اور چھوہارے تقسیم ہو رہے تھے۔ پُرتکلف کھانے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس روز صبح نواب سعداللہ جان نے فون پر غزل سے بات کی تھی اور کہا تھا۔ "آج شام ہمارا نکاح ہے۔ ہم ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بن جائیں گے لیکن اس کے بعد بھی ہمارے درمیان رسم و رواج حائل رہیں گے۔ تمہاری رخصتی نہیں ہو گی اور ہم آہیں بھرتے رہ جائیں گے۔ کیا تم ہماری بے چینی سے ہماری محبت کا اندازہ کر سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "بے شک.......... آپ نے محبت کی انتہا کی ہے۔ ہمیں اپنا بنانے سے پہلے ہمیں زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔"

"خدارا! آپ احسان کا لفظ نہ استعمال کرو۔ ہماری محبت کی توہین ہو گی۔ کیا تم محبت کا جواب محبت سے نہیں دو گی؟ تم ایک شاعرہ ہو' کوئی شعر سنانے کے بہانے ہی دل کا حال بیان کر دو۔"

"دراصل میرے اور آپ کے درمیان ابھی اجنبیت ہے۔ میں پہلے کبھی کسی اجنبی درخت کے سائے میں نہیں گئی۔ اسی حوالے سے اپنے پسندیدہ شاعر بشیر بدر کا ایک شعر عرض کرتی ہوں۔"

اجنبی پیڑوں کے سائے میں محبت ہے بہت
گھر سے نکلو تو یہ دنیا خوبصورت ہے بہت

انہوں نے لہک لہک کر داد دی۔ "بہت خوب۔ کیا شعر کہا اور اپنے حسبِ حال کہا ہے۔ چشمِ بد دُور کہیں آپ کو ہماری نظر نہ لگ جائے۔"

وہ ہنسے ہوئے بولی۔ "بشیر بدر کو نظر لگے گی۔ میں تو یہی کہہ سکتی ہوں۔

ع شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

"رُسوا نہیں کیا ہے۔ تم نے باذوق ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ موزوں اشعار کے انتخاب کے لئے باذوق ہونا لازمی ہے۔ بخدا.......... جی چاہتا ہے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک تم سے گفتگو کرتے رہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ایسی شامیں اور ایسی صبحیں جلد ہی ہماری زندگی میں آ جائیں۔"

"نواب صاحب! میں آپ کی محبت اور اس کی شدت پر حیران ہوں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی کوئی چاہنے والا میری زندگی میں یوں خزانے لٹانے آئے گا۔"

"ہم تو دل و جان لٹا رہے ہیں۔ تم سے ایک گزارش ہے۔ کیا ہماری ایک بات مانو گی؟"

"وہ بات ماننے والی ہوئی تو کبھی انکار نہیں کروں گی۔"

"تم چاہو تو مان سکتی ہو' نہ چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔ ہم ایک بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اخلاق و تہذیب کے خلاف تم سے کوئی بات نہیں منوائیں گے۔"

"پھر تو میں آپ کی ہر بات مان لوں گی۔"

"نکاح کے بعد ہم میاں بیوی بن جائیں گے۔ ایک شوہر کو اتنا حق دے دو کہ وہ تمہاری رخصتی تک تم سے ملتا رہے۔ تم ہم سے پردہ نہ کرو۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ رہنا چاہئے۔"

"آپ ایسی خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں جس پر دنیا والے باتیں بنائیں گے۔"

"نکاح کے بعد ہم ایک دوسرے کے لئے نامحرم نہیں رہیں گے۔ دنیا والوں کے اعتراضات بے بنیاد ہوں گے۔ اگر رسم و رواج کے خلاف عمل کرنے سے تمہاری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہو تو تمہیں ہماری بات مان لینی چاہئے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ان کی باتیں رسم و رواج کے منافی تھیں لیکن اخلاق و تہذیب کے خلاف نہیں تھیں۔ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے کے روبرو آ سکتے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کے احسانات بے شمار تھے۔ اسے اخلاقاً بھی ان کی بات مان لینی چاہئے تھی۔ وہ بولی۔ "نکاح کے بعد میں آپ کے احکامات کی پابند رہوں گی اور آپ کی یہ بات بھی مان لوں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولے۔ "تم ہمیں اتنی خوشیاں دے رہی ہو جن کی ہمیں امید نہیں تھی۔ نکاح کے بعد ہم تمہارے پاس آ کر تمہیں دیکھنا چاہیں گے۔ ایک دولہا اپنی دلہن کو نہ دیکھے تو یہ بہت بڑی زیادتی ہو گی۔"

"خدا نہ کرے کہ آپ پر کوئی زیادتی ہو۔ آپ جب چاہیں اپنی کنیز کے پاس آ سکتے ہیں لیکن ایک گزارش ہے کہ آپ میری رخصتی تک کوئی حد پار نہیں کریں گے۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں۔ ہم تمہاری رضامندی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہاتھ ضرور پکڑیں گے لیکن پہونچے تک نہیں پہنچیں گے۔"

ان دونوں کے درمیان یہ ساری باتیں صبح فون پر طے ہو گئی تھیں۔ نکاح کے بعد وہ تمام عزیز و اقارب کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ آسیہ اور اسد اللہ کی بیگم نے نواب سعد اللہ جان کو غزل کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ سرخ گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کے باہر اس کے گورے گورے مہندی والے ہاتھ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہ بستر کے سرے پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان لمحات میں وہ کچھ تو جذبوں کی حدت سے اور کچھ بڑھاپے کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ سانسوں کی آمد و رفت بے ترتیب ہو رہی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں سینے کے اندر کھینچنے لگے۔

وہ گھونگھٹ میں چھپی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سانسوں کی بے ہنگم آوازیں سن کر چونک گئی۔ حیرانی سے سوچنے لگی۔ "نواب صاحب ایسی آوازیں کیوں نکال رہے ہیں؟"

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھے بڑی تکلیف سے سانسیں کھینچ رہے تھے اور دوسرا ہاتھ شیروانی کی جیب میں ڈال کر وہاں سے کچھ نکالنا چاہ رہے تھے' لیکن تکلیف کے باعث بدن لرز رہا تھا۔ دونوں ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے تھے۔ وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ گھونگھٹ کو ایک طرف پھینکتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا؟ نواب صاحب! کچھ بتائیں؟ یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟"

وہ قریب آ گئی۔ انہوں نے شیروانی کی جیب سے ہاتھ نکالا تو اس ہاتھ میں ایک انہیلر تھا۔ وہ انہیلر کو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ دمہ کا مرض ہے۔ وہ سانس نہیں لے پا رہے ہیں۔ اس کے ابو بھی گلے کے آپریشن سے پہلے اسی طرح سانسوں کی تکلیف میں مبتلا رہتے تھے اور انہیلر کے ذریعے سانس بحال کرتے تھے۔

اس نے جلدی سے انہیلر ان کے ہاتھ سے لیا' اسے اچھی طرح ہلا کر کہا۔ "اسے فوراً منہ میں رکھیں۔"

انہوں نے اسے منہ میں رکھ کر اندر ایک لمبی سانس کھینچی۔ غزل نے اسے منہ سے نکال کر اس کا ڈھکن بند کر دیا۔ تیزی سے چل کر باتھ روم میں گئی وہاں سے ایک اُگالدان

اٹھا کر لے آئی۔ سانس کی نالیوں میں اٹکا ہوا بلغم باہر نکل آیا۔ وہ آسانی سے سانس لینے لگے۔ اتنی دیر میں وہ پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔ نڈھال ہو کر اپنی دلہن کے بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ وہاں دولہا کو متحرک ہونا چاہئے تھا مگر دلہن متحرک تھی۔ ایک تولیہ لے کر ان کے چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کئے پڑے ہوئے تھے حالانکہ طبیعت سنبھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ سکتے تھے لیکن اس وقت بڑی ندامت محسوس کر رہے تھے۔ آنکھیں کھول کر نئی دلہن سے نظریں نہیں ملانا چاہ رہے تھے۔ یہ بھول رہے تھے کہ آنکھیں بند کر لینے سے پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے مگر اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ جوانی کا سانس لیتا ہوا پہاڑ ان کے قریب تھا۔ وہ اتنی قریب تھی کہ اس کے بدن کی آنچ لگ رہی تھی۔ وہ آگ تاپنے کے لئے نہیں تھی' کھیلنے کے لئے تھی اور ایسی تھی کہ اس سے بچے اور بوڑھے نہیں کھیل سکتے تھے۔

آنکھیں تو کھولنی ہی تھیں۔ وہ ساری زندگی وہاں پڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ غزل بڑے ہی ممتا بھرے انداز میں ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ ایک طرح سے یہ بیماری ان کے لئے سودمند ثابت ہو رہی تھی۔ وہ صرف اس کے روبرو آنے کی تمنا کر رہے تھے۔ اسے چھو لینے کی منزل بہت دور تھی لیکن وہ اچانک ہی ان کے قریب آ کر انہیں چھو رہی تھی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرنے کے انداز میں اتنی چاہت تھی کہ ان لمحات میں وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ عاشق اور دیوانے تو پہلے سے ہی تھے لیکن شمع قریب سے قریب تر ہو جائے تو پروانہ وار جلنے مرنے کا عشق کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

انہوں نے وارفتگی میں اس کا ہاتھ تھام لیا پھر بڑے جذب کے عالم میں بولے۔ "تم ہماری توقع سے زیادہ محبت اور اپنا پن دے رہی ہو۔ ہم نادم ہیں۔ ہماری اس بیماری سے تمہیں دکھ پہنچ رہا ہوگا۔"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے دُکھ نہیں تشویش ہے۔ اچانک دورہ پڑتے وقت آپ کو کون سنبھالتا ہوگا؟ آپ کی بیگم تو وہیل چیئر پر رہتی ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "ہمارے پاس سب کچھ ہے' لیکن تمہارے

جیسی پیار کرنے والی اور توجہ دینے والی نہیں تھی۔ وعدہ کرو ہماری آخری سانس تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔"

ان لمحات میں غزل کو یاد آیا کہ ایک رات وہ اپنی امی کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس کے ابو بہت بیمار تھے۔ اس کی امی کا ہاتھ تھام کر کہہ رہے تھے۔ "تم دن رات میری خدمت کرتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری آخری سانسوں تک میرے ساتھ رہو گی۔"

غزل نے اپنائیت سے نواب صاحب کو دیکھا۔ وہی بڑھاپا تھا' وہی بیماری تھی۔ نواب صاحب نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اسے وہی جانا پہچانا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ حیات کے آخری لمحوں تک آپ کے ساتھ رہوں گی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"تم نے مسیحا بن کر ہمارے اندر نئی روح پھونک دی ہے۔ پہلے چلتے پھرتے تھے اب تو دوڑنے لگیں گے۔ ہواؤں میں اڑنے لگیں گے۔" وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

وہ بولی۔ "آپ کو آرام سے لیٹنا چاہئے۔ آپ نے تو کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے کچھ کھانے کو لے آؤں۔"

"تم ہمارا ساتھ دو گی؟"

"میں تو ہر معاملے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آج آپ کے قریب آ کر معلوم ہو رہا ہے کہ کس قدر تنہا ہیں۔ آپ کو تنہا نہیں رہنا چاہئے۔"

"ہم اسی لئے جلد سے جلد تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن تم نے رخصتی سے انکار کیا اور ہم مان گئے۔ ہمیں اپنے آرام سے زیادہ تمہاری خوشی کا خیال ہے۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے کوئی جوان اور ہٹا کٹا اجنبی نہیں تھا' ایک بے بس بوڑھا تھا۔ وہ کسی بھی پہلو سے سکندر کا رقیب نہیں لگ رہا تھا۔ اب ان کے تمام احسانات غزل کے احساسات پر حاوی ہو رہے تھے۔ ایک عورت کے اندر چھپی ہوئی ممتا اور مسیحائی کو پکار رہے تھے۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ "میرا فیصلہ غلط تھا۔ مجھے رخصتی سے انکار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ آپ کے

ساتھ جاؤں گی۔"

وہ خوشی سے کھل گئے۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام کر بولے۔ "تم اپنے فیصلے سے ہمیں حیران کر رہی ہو۔ وہ مسرتیں دے رہی ہو جن کی ہم توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

"لیکن آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

"ایک نہیں ہزار باتیں منوالو۔ اپنے نام ہماری زندگی لکھوالو۔ بولو کیا چاہتی ہو؟"

"آپ کچھ علیل سے ہیں۔ آپ نہ جائیں۔ یہیں رہ جائیں۔ کل آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو میں آپ کے ساتھ یہاں سے جاؤں گی۔ میں ابھی امی سے کہتی ہوں کہ کل میری رخصتی ہو گی۔"

"آج صحیح معنوں میں ہمیں اپنی خوش قسمتی کا یقین ہو رہا ہے۔ ہم بھی اپنے بھائی اسداللہ سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ واپس جائے اور کل تک ہماری خواب گاہ کو خوب صورتی سے سجا دے۔ ہم ابھی جا رہے ہیں۔ جلد ہی واپس آ کر تمہارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی آسیہ اندر آ گئی۔ مسکرا کر بولی۔ "نواب صاحب تھوڑی دیر کے لئے آئے تھے لیکن ملاقات لمبی ہو گئی۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا ہے۔ تم نے کیا جادو کیا ہے؟"

"اچھے اعمال جادو کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ہم سب اپنے اپنے اعمال کا حساب کریں تو سمجھ میں آئے گا کہ نیک نیتی کیسے عروج پر پہنچاتی ہے اور بدقسمتی کس طرح زوال کی طرف لے جاتی ہے۔"

آسیہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس کے زوال کی طرف اشارہ تھا۔ غزل نے انٹرکام کے ذریعے اپنی امی کو بلوایا۔ انہوں نے آ کر کہا۔ "بیٹی! سب نے کھانا کھا لیا ہے۔ تم نے اور نواب صاحب نے نہیں کھایا ہے۔ کیا یہاں کھانا بھیج دوں؟"

"جی ہاں' نواب صاحب آج یہیں رہیں گے۔ کل میں رخصت ہو کر ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

وہ حیرت اور مسرت سے بولیں۔ "خدا کا شکر ہے۔ تم نے فیصلہ بدل کر نواب

صاحب کو اور خوش کیا ہے۔"

آسیہ نے کہا۔ "لیکن امی! آج صرف نکاح کی بات تھی۔ نواب صاحب یہاں رہیں گے تو لوگ باتیں بنائیں گے۔"

غزل نے کہا۔ "باہر کتے بھونکتے ہی رہتے ہیں۔ گھر میں بھونکنے کی جرأت کسی میں نہیں ہو گی۔ ہم ایک دوسرے کے لئے نامحرم نہیں ہیں۔ نکاح ہو چکا ہے' یہ حقیقت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہے تو نہ آئے۔ بھابی جان! آپ کی سمجھ میں آرہی ہے نا؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں ہاں۔ آج نہیں تو کل' تمہیں اپنے گھر جانا ہے۔ اب تم خود مختار ہو۔ جب چاہو جا سکتی ہو۔ ابھی جا کر تمہارے بھائی جان کو خوش خبری سناتی ہوں۔"

وہ کمرے سے چلی گئی۔ باہر ہمنوا نے یہ سنا کہ غزل رخصتی کے لئے راضی ہو گئی ہے تو انہیں سب سے زیادہ خوشی ہوئی۔ دوسرے رشتے داروں کو بھی خوشی ظاہر کرنی پڑی۔ مہوش' اسد اللہ جان اور اس کی بیگم نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ نئی دلہن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور وہ پوری طرح انہیں سحر زدہ کر چکی ہے۔

وہ تمام براتی اپنے دولہے کو دلہن کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ نواب صاحب' غزل کے بیڈ روم میں واپس آ گئے۔ وہاں گرما گرم کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ کر کھانے اور باتیں کرنے لگے۔ غزل نے کہا۔ "کل میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ ہی کے ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں۔ یہ بھی تو آپ ہی کی کوٹھی ہے۔"

"یہ کوٹھی ہماری نہیں تمہاری ہے۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے کہا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر یہ تمہارے نام ہو جائے گی۔"

"پھر بھی یہ میرا میکا نہیں ہے۔ آپ اسے گفٹ کے طور پر دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود میری ہر چیز آپ کی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کبھی آپ کے ساتھ وہاں رہوں اور آپ کبھی میرے ساتھ یہاں رہیں۔"

"ہم سمجھ گئے۔ تم اپنے والدین کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔ یہاں آکر ان کی تنہائی دور کرنا چاہتی ہو۔"

"جن والدین کے بیٹے جیتے جی انہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں' وہ تنہائی کا عذاب سہتے رہتے ہیں۔ بیٹیاں ان کی تنہائیاں دور کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کے زخم نہیں بھرتے پھر بھی وہ مرہم لگاتی رہتی ہیں۔"

وہ بیٹوں کی بے حسی اور خود غرضی کے موضوع پر بولتی رہی پھر کہا۔ "میں نہیں چاہتی' بھائی جان اپنے کنبے کے ساتھ آ کر رہنے لگیں۔ ہم یہاں آکر رہا کریں گے تو وہ یہاں ڈیرا نہیں جمائیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "تمہارے والدین سے صرف بیٹا دور نہیں ہوا ہے۔ پوتے پوتی بھی ان سے چھین لئے گئے تھے۔ انہی اہم لہو کے رشتوں سے گھر میں مسرتوں کا میلہ لگتا ہے۔ اب تمہارے طفیل یہ گمشدہ مسرتیں پھر تمہارے والدین کو مل رہی ہیں۔ اس طرح ان کے زخم بھریں گے۔"

"لیکن بھائی جان اور بھابی جان دونوں ہی خود غرض ہیں۔ انہوں نے ہمیں بری طرح مجروح کیا ہے۔ میں ان کی بے حسی اور خود غرضی کو کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔"

"نہ بھولو۔ زندگی کے تلخ تجربات کو یاد رکھا کرو۔ جو غلط ہیں' وہ غلط رہیں گے۔ انہیں ان کے انجام پر چھوڑ دو۔ یہ دیکھو کہ تم اپنے والدین کی چھینی ہوئی مسرتیں انہیں واپس دے رہی ہو۔ تم اپنے کھاتے کی نیکی کرتی رہو۔ دوسروں کی بدی کا حساب خدا پر چھوڑ دو۔"

انہوں نے کھانے کے بعد کلی کی۔ دانت صاف کئے پھر پانی پینے کے بعد کہا۔ "میں بھی خود غرض رشتے داروں کے ہجوم میں رہتا ہوں۔ وہ برسوں سے میری کوٹھی میں رہائش پذیر ہیں۔ اچھا پہنتے ہیں' اچھا کھاتے ہیں۔ دکھ بیماریوں میں ان کا علاج ہوتا ہے۔ تمہیں ہر دولت مند گھرانے میں ایسے رشتے دار ملیں گے۔ انہیں ازراہ ہمدردی برداشت کرنا چاہئے لیکن اپنے مال و دولت میں اور اپنے ذاتی معاملات میں انہیں شریک نہیں کرنا چاہئے۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں۔ ایک خاندان بنائے رکھنے کے لئے بے مروت اور ناقابل برداشت رشتے داروں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی بات کریں۔ کیا ڈاکٹروں سے باقاعدہ علاج کراتے رہتے ہیں؟"

"ہاں بس یونہی کبھی بلغم جمع ہو جاتا ہے تو سانسوں کی آمدورفت میں دشواری ہوتی ہے۔ پھر تم نے دیکھا ہے کہ انہیلر کے ذریعے فوراً سانس بحال ہو جاتی ہے۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

"سراسر پریشانی ہے۔ کسی بھی بیماری کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ کل سے آپ کا علاج میری نگرانی میں ہو گا۔"

وہ مسکرا کر بولے۔ "ہم اپنی تمام زندگی تمہاری نگرانی میں گزاریں گے۔"

پھر انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ہمیں ندامت ہے کہ یہاں آتے ہی ہماری طبیعت خراب ہو گئی۔ ہم تمہارا گھونگھٹ نہ اٹھا سکے۔ ماشاء اللہ تم تو ویسے بھی خوب صورت ہو۔ آج دلہن بن کر اتنی حسین لگ رہی ہو کہ ہمارے پاس تعریف کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔"

انہوں نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکال کر اس کی ایک انگلی میں پہنائی۔ دولہا جب پہلی بار اپنی دلہن کے کورے بدن کو چھونا چاہتا ہے تو اسے چھونے کا کوئی بہانہ ہونا چاہئے اس لئے یہ رسم بنائی گئی ہے۔ انگوٹھی پہنانے کے بہانے ہاتھ پکڑنے کی ابتدا ہوتی ہے۔

ان کے ہاتھ تھامنے سے غزل کے اندر کوئی سنسنی پیدا نہیں ہوئی لیکن وہ سنسنانے لگے۔ مہندی والے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے حنا کی خوشبو پر کوئی شعر پڑھا تو ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اور آواز بھی لرز رہی تھی۔ بے چارے اندر ہی اندر پریشان ہو رہے تھے۔ جوان جذبے بوڑھی ہڈیوں کو جھنجھوڑتے ہیں تو اوپر سے بدن لرزتا ہے اور منہ سے بے ہنگم آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔

وہ خود پر قابو پانا چاہتے تھے۔ کوشش کر رہے تھے کہ جذبے فوراً ہی شور نہ مچائیں۔ ذرا سنبھل سنبھل کر مرحلہ وار آگے بڑھیں۔ آگے اور بھی عشق کے امتحان ہیں۔

غزل نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپ لرز رہے ہیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام سے لیٹ جائیں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "نہیں ہم ٹھیک ہیں۔ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ دراصل تمہارا رعبِ حسن طاری ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں' بے انتہا حسین بھی ہو اور ہمارے مقابلے میں کمسن بھی ہو۔ ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ ہم تم پر ظلم تو نہیں کر رہے ہیں۔"

"یہ سوچنے اور سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے۔ سپاہی میدانِ کارزار میں قدم رکھنے کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ فی الحال آپ علیل ہیں۔ ایسی باتیں نہ کریں۔ آئیں' آرام سے بستر پر لیٹ جائیں۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر آ گئے۔ اس نے کسی' اور پہلو ایک سپاہی کا حوالہ دیا تھا۔ نواب صاحب اسے کسی اور پہلو سے دیکھ رہے تھے۔ مردانگی کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ بیڈ پر آتے ہی انہوں نے اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ "پلیز' آرام سے رہیں۔ آپ بیمار ہیں۔ کمزور ہیں۔"

آدمی کی یہی کمزوری ہے کہ وہ خود کو کمزور تسلیم نہیں کرتا۔ کمزور کہا جائے تو اسے چیلنج سمجھ لیتا ہے۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے کنیزوں کو پہلو میں رکھ کر ان کے اندر غزل کو دیکھتے آئے تھے۔ ایک تجسس تھا' وہ کیسی ہو گی' جب کہ سب ہی ایک جیسی ہوتی ہیں' لیکن ہوس کہتی ہے' الگ الگ نشہ ہے' الگ الگ مدہوشی ہے' بوتل ایک جیسی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ پینے پلانے کے انداز جداگانہ ہوتے ہیں۔

غزل تو ان کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ آخر انہوں نے اسے خواب گاہ کی زینت بنا لیا تھا۔ تدبیر سے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض حالات میں تقدیر اس اصول کو جھٹلا دیتی ہے۔ جوانی کا معجون ملتا ہے' توانائی نہیں ملتی۔ حسینہ ملتی ہے تو پسینہ آ جاتا ہے۔

اگرچہ بیڈ روم ائرکنڈیشنڈ تھا پھر بھی وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ غزل ان کی حالت سے بے خبر تھی۔ ان کے پاس رہ کر' ان سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ ایک عالم بے خودی میں تھی۔ کہیں پہنچی ہوئی تھی۔ بے خودی کہہ رہی تھی۔

بس گئی ہے مرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو میں لگاؤں تیری خوشبو آئے

ہائے! تم کہاں کھو گئے تھے؟ کتنی مدت کے بعد مجھے بازوؤں میں سمیٹ رہے ہو۔ میں انتظار کی دہلیز پر ہر لمحہ تمہیں پکارتی رہی۔ ہائے ہرجائی کہیں کے! آج آئے ہو تو ٹھہر کیوں گئے ہو؟ تھم کیوں گئے؟ دریا کا بہاؤ کبھی رکتا نہیں ہے۔ اے میرے دجلہ و فرات! کیوں تھم گئے۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نواب صاحب سکڑے سمٹے اس سے منہ پھیر کر سر

جھکائے ہوئے تھے۔ وہ خواب و خیال کے فریب سے نکلتے ہی کرب میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے پیشِ نظر وہ نہیں تھا۔ جسے عالم بے خودی میں دیکھ رہی تھی۔ کوئی اور تھا۔ مجازی خدا تھا۔ پار اتارنے والا ناخدا نہیں تھا۔

اس خواب گاہ میں پہلے بھی خاموشی تھی۔ اب وہاں خاموش ندامت تھی۔ وہ ایک لڑکی سے کمتر ہو گئے تھے۔ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔

وہ جھاگ کی طرح بیٹھے رہے۔ جو لوگ جوانی کے بینک اکاؤنٹ سے آدھا خرچ کرتے رہے ہیں' آدھا بچاتے ہیں وہ آدھی بچت بڑھاپے میں کام آتی ہے۔ ان کا بینک اکاؤنٹ خالی ہو چکا تھا۔ وہ اس حقیقت کو مانتے نہیں تھے۔ بڑی خوش فہمی میں رہ کر ہوس کا نیا چیک لکھتے تھے۔ وہ کیش نہیں ہوتا تھا۔ کاؤنٹر سے واپس آ جاتا تھا۔ بعد میں ندامت ہوتی تھی جیسے اب ہو رہی تھی اور جیسے آئندہ بھی ہونے والی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خود کو سمجھا رہے تھے 'گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ ہم ہمیشہ نہیں گریں گے۔ ہمیشہ ناکامی نہیں ہوتی۔ ہاری ہوئی بازی کسی وقت جیت لی جاتی ہے۔

وہ باتھ روم سے باہر آئی۔ اس نے گیلے بدن پر دوسرا لباس پہنا تھا۔ کہیں کہیں سے بھیگا بدن مقناطیس کی طرح پکار رہا تھا۔ بھیگے بالوں سے پانی کے شفاف قطرے چہرے پر اور گردن پر ایسے پھسل رہے تھے جیسے ارادے پھسلتے ہیں۔ گوری رنگت کہہ رہی تھی کہ دودھ سے نہا کر آئی ہے۔ اگر دیکھنے والے کی نیت پھسل جائے تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکتی ہے۔

نواب صاحب اسے دیکھتے ہی جا رہے تھے۔ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ ہانپنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔ "بخدا حسن مجسم ہو۔ سراپا غزل ہو۔ ہماری جان نکال رہی ہو۔ ہم شرمندہ ہیں۔ ابھی جو ہوا' اسے ہم اپنی بدنصیبی سمجھتے ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دراصل شام ہی سے طبیعت مضمحل تھی۔ تم نے دیکھا تھا سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں پھر ہم نے دوائیں باقاعدگی سے نہیں لی تھیں۔ دراصل ہم دوائیں بھول آئے ہیں۔"

وہ قریب آ کر بولی۔ "آپ وضاحت نہ فرمائیں۔ میں آپ کی عمر اور کمزوریوں کو

سمجھ رہی ہوں۔"

وہ ایک دم سے تڑپ کر بولے۔ "تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری عمر زیادہ نہیں ہے۔ نکاح نامہ پڑھ لینا۔ اس میں اڑتالیس برس لکھی ہوئی ہے۔"

غزل نے انہیں گہری نظر سے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گئے۔ ہچکچاتے ہوئے بولے "حساب میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ عمر ایک آدھ برس کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی۔ اس کی شخصیت دیکھی جاتی ہے۔"

وہ بولی۔ "آپ زیادہ نہ بولیں۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آپ دوائیں بھی لے کر نہیں آئے ہیں۔ پلیز آرام سے لیٹ کر سونے کی کوشش کریں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔ "آج شادی کی پہلی رات ہے۔ تم سونے کو کہہ رہی ہو؟"

"میرے سہاگ کی پہلی رات ہے۔ آپ کی نہیں۔ آپ سو سکتے ہیں۔"

"ہمیں یوں لگ رہا ہے جیسے تم ناراض ہو؟"

"میں ناراض نہیں ہوں۔ آپ کے سونے جاگنے' آپ کا علاج کرانے اور آپ کو دوائیں کھلانے کی ذمے داری میری ہے۔ آپ سے گزارش ہے۔ اپنی تمام میڈیکل رپورٹس مجھے پڑھائیں۔ میں ڈاکٹروں سے بات کروں گی اور پوری توجہ سے علاج کراؤں گی۔"

"تم ناحق پریشان ہو رہی ہو۔ ہم ڈاکٹروں کے علاج کے علاوہ ایک حکیم صاحب سے اور ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے علاج کرا رہے ہیں۔ باقاعدگی سے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔"

"تین طرح کے ڈاکٹروں سے علاج جاری ہے۔ ان کی بے شمار دوائیں کھا رہے ہیں۔ یہ میرے لئے تشویش کی بات ہے کہ آپ صحت مند اور توانا کیوں نہیں ہیں؟ یا تو دوائیں مؤثر نہیں ہیں یا پھر بیماریاں تشویش ناک ہیں۔"

"خدارا' غلط نہ سمجھو۔ ہم تشویش ناک امراض میں مبتلا نہیں ہیں۔"

"نواب صاحب' امراض معمولی ہوں تب بھی ان کا اثر میری ازدواجی زندگی پر پڑ رہا ہے۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گے؟"

سانچ کو کیا آنچ والی بات تھی۔ سچائی ابھی سامنے آئی تھی۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ غزل نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ ایک ہی شرط پر زندگی گزاروں گی۔ آئندہ کا علاج میری نگرانی میں میرے اطمینان کے مطابق ہو گا۔"

انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "اگر ہم یہ شرط ماننے سے انکار کر دیں تو کیا تم ہماری زندگی سے نکل جاؤ گی؟"

"آپ دانا ہیں۔ اگر آپ بھرپور صحت مند زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہیں گے تو ہم کس لئے ایک چھت کے نیچے زندگی گزاریں گے۔"

"آدمی کبھی صحت مند اور کبھی بیمار ہوتا ہے۔ کبھی شہ زور اور کبھی کمزور ہوتا ہے۔ آج ہم بیمار ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سدا بیمار رہیں گے۔ ہم بہت مہنگا علاج کرا رہے ہیں۔ ہمیں جلد توانائی حاصل ہو گی۔"

"میں اپنی نگرانی میں علاج کرانا چاہتی ہوں۔ آپ کو اعتراض کیوں ہے؟ ہم میاں بیوی ہیں۔ کیا آپ بیوی سے بیماریاں چھپائیں گے؟"

"ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم پہلی ہی رات اتنی بے باکی سے گفتگو کرو گی۔"

"میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ پہلی ہی رات ایسا ذہنی جھٹکا دیں گے کہ میں چشم زدن میں اس قدر بے باک ہو جاؤں گی۔ میں آپ سے صاف کہہ رہی ہوں کہ آپ کی دولت کی چمک دمک سے میرا مستقبل روشن نہیں ہو گا۔ مجھے آپ کی صحت مندی اور توانائی سے روشنی اور مسرتیں ملیں گی۔ لہٰذا میں اپنی نگرانی میں آپ کا علاج کراؤں گی۔ برس دو برس تک انتظار کروں گی۔ آپ مجھے زندگی کی حقیقی.......... مسرتیں دیں گے تو ساری زندگی وفا کروں گی۔ ورنہ ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر اس کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا تم ہم سے الگ ہو کر کوٹھی، کار اور لاکھوں روپے کے بینک بیلنس سے محروم ہونا چاہو گی؟ خوش قسمتی سے جو عزت اور اونچا مقام مل رہا ہے، وہاں کی بلندی سے نیچے گرنا چاہتی ہو؟"

"میں ابھی اپنی امی اور ابو کے ساتھ یہاں سے جا کر ثابت کر سکتی ہوں کہ مجھ میں گرنے کا حوصلہ ہے لیکن آپ میں اٹھانے اور سنبھالنے کی سکت نہیں ہے۔"

ان کی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بستر کے سرے پر آ کر بیٹھ گئے پھر اتر کر ٹہلنے کے

انداز میں اس سے دور گئے۔ پلٹ کر قریب آئے پھر بولے۔ "ہم بھول گئے تھے کہ پہلے تمہاری کوئی بلندی نہیں تھی۔ کسی پسماندہ علاقے میں جاؤ گی تو تمہارے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم تو سدا بلندیوں پر رہے ہیں۔ گرنے کا اندیشہ ہمیں ہے۔ تم ایک ہی رات میں ہمیں چھوڑ کر جاؤ گی، تو ہم پر انگلیاں اٹھائی جائیں گی۔ باتیں بنائی جائیں گی کہ ہم ایک جوان اور کمسن لڑکی کے قابل نہیں ہیں۔ ہماری بیگم ماہ لقا کے تمام خاندان والے ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ ہمارے دوست احباب ہماری اونچی سوسائٹی کے لوگ ہمارے منہ پر کچھ نہیں کہیں گے لیکن ہم ان سے نظریں نہیں ملا سکیں گے۔ سب ہی بوڑھی جوانی کا طعنہ دیں گے۔ ہماری شادی دنیا والوں کے لئے مذاق اور ہمارے لئے گالی بن جائے گی۔"

"آپ چاہیں تو یہ شادی مذاق بنے گی نہ گالی۔ میری یہی ایک شرط مان لیں۔ مجھے ایک بیوی کے مکمل حقوق دیں اور میری نگرانی میں علاج کرائیں۔"

وہ پھر ٹہلتے ہوئے دور چلے گئے۔ وہاں سے اسے دیکھا، پھر قریب آتے ہوئے بولے۔ "یہ انسان کی کمزوری ہے۔ وہ اپنی کمزوریاں چھپاتا ہے۔ ہم بھی اپنی بیماریاں چھپاتے ہیں۔ تمہارے سامنے بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں شرم آتی ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ اس معاملے کو صرف ہماری ذات تک محدود رہنے دو۔"

"پھر تو آپ بیوی کے حقوق مجھے نہیں دے رہے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے ہمراز ہوتے ہیں اور آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے کہ میں ہمراز بن کر رہ سکوں گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پہلی ہی ملاقات میں ہماری توقع سے زیادہ اپنائیت اور محبت دے رہی ہو۔ بہرحال ہمیں تمہاری شرط منظور ہے لیکن یہ منظور نہیں ہے کہ تم ہمیں کبھی چھوڑ کر جاؤ گی۔"

"آپ نے میری بات مان لی۔ آپ آئندہ دیکھیں گے کہ میں آپ کی بیماریوں اور کمزوریوں سے کس طرح جنگ کرتی رہوں گی۔"

انہوں نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب انہیں ہاتھ تھامنے کی حد تک ہی گزارا کرنا تھا۔

☆-----☆------☆

وہ دوسری رات رخصت ہو کر نواب صاحب کی کوٹھی میں آ گئی۔ خواب گاہ کو اس

کے شاعرانہ ذوق کے مطابق سجایا گیا تھا۔ دولت کی بھرپور نمائش کی گئی تھی۔ نواب صاحب بڑے فخر سے اسے لے کر خواب گاہ میں آئے۔ اس نے دائیں بائیں سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔ "تم نے دیواروں پر تصویریں نہیں دیکھیں۔ مصور نے بڑی مہارت سے عمر خیام اور غالب کے خاکے بنائیں ہیں۔"

اس نے کہا۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں آتے ہی مجھے تمام میڈیکل رپورٹس دکھائیں گے۔"

"یہاں تمام رپورٹس پڑی ہیں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ صبح انہیں پڑھ لینا۔ کیا پیار و محبت سے وقت نہیں گزارو گی؟"

"پیار و محبت کے لئے ساری زندگی پڑی ہے اور محبت وہی اچھی ہوتی ہے جو صحت مند ہو۔ آپ پہلے جسمانی صحت مندی کی طرف توجہ دیں۔"

وہ معقول بات کہہ رہی تھی لیکن نواب صاحب سبکی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بے دلی سے الماری کھول کر تمام میڈیکل رپورٹس نکالیں پھر اس کے سامنے لا کر رکھ دیں۔ وہ انہیں ایک ایک کر کے پڑھنے لگی۔ ان سے مختلف امراض کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ وہ ایک نہیں کئی امراض میں گرفتار تھے۔ غزل نے سوچا تھا' کوئی ایک مرض ہو گا تو وہ توجہ سے ان کا علاج کرائے گی پھر ان کے ساتھ ایک پُرمسرت اور خوش گوار زندگی گزارے گی۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "میں سمجھ رہی تھی آپ کو صرف دمہ ہے' لیکن پائلز بھی ہے۔ معدہ بھی کمزور ہے۔ گیس کے پیدا ہونے سے سینے میں جلن ہوتی ہے۔ یہ گیس دماغ پر چڑھ جاتی ہے۔ ایک گردہ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ سب سے پہلی ایکسرے رپورٹ پہلے بیس برس کی ہے۔ آپ اتنے برسوں سے اتنی بیماریاں پالتے رہے ہیں۔"

وہ سر جھکائے سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دھیمی آواز میں بولے۔ "ہم شرمندہ نہیں ہونا چاہتے تھے اس لئے یہ سب کچھ چھپا رہے تھے۔"

"پہلے ڈاکٹروں سے بھی چھپاتے رہے ہوں گے اور شرمندہ ہوتے رہے ہوں گے۔ آپ بدپرہیزی' بداحتیاطی اور شرمندگی کے باعث بیماریاں بڑھاتے رہے ہیں۔"

وہ تمام رپورٹس سینٹر ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں ایک طرف ہٹاتے ہوئے

بولے۔ "یہ رپورٹس دراصل ہمارے اعمال نامے ہیں۔ اب ہم کچھ نہیں چھپائیں گے۔ ہم نے اپنی جوانی کو بڑی بے دردی سے خرچ کیا ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم وغیرہ یہ کھل کر نہیں کہتے کہ ہم کھوکھلے ہو گئے ہیں۔ وہ جھوٹی تسلیاں دے کر ہمارا علاج کرتے رہتے ہیں۔ تم چاہے جتنی توجہ سے ہمارا علاج کراؤ۔ وہ تمہیں بھی دلاسے دیتے رہیں گے۔ کوئی خاطر خواہ نتیجہ تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔"

"آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے طور پر آپ کا علاج نہ کراؤں؟"

"بے شک کراؤ۔ تم جو کرنا چاہو گی ہم اعتراض نہیں کریں گے لیکن ہم تم سے کچھ اور چاہتے ہیں۔"

غزل نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ "ہم نے خود کو کبھی بوڑھا تسلیم نہیں کیا۔ آج تسلیم کر رہے ہیں اور تم سے پوچھ رہے ہیں۔ کیا ایک بوڑھے اور بیمار کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔"

انہوں نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ غزل نے انہیں ہمدردی سے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ چاہتے ہیں۔ میں دکھاوے کی بیوی بن کر آپ کے ساتھ رہوں۔"

"تم چاہو تو رہ سکتی ہو۔ ہم سے سمجھوتا کر کے اونچی سطح پر شان و شوکت سے زندگی گزار سکو گی۔ خدارا! یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہیں مال و دولت کا لالچ دے رہے ہیں۔ تم کل ہی یہ واضح کر چکی ہو کہ یہ مہنگی آسائشیں چھوڑ کر جا سکتی ہو لیکن ہم چاہتے ہیں کہ شان و شوکت سے ایک باوقار خاتون کی طرح زندگی گزارو۔ ہماری بھی عزت کا خیال کرو۔ اس عمر میں ایک جوان لڑکی چھوڑ کر جائے گی تو دنیا کہے گی' بڑھاپے کو ٹھکرا کر گئی ہے۔ ہم کسی سے نظریں نہیں ملا سکیں گے۔"

انہوں نے جھجکتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ اسے غزل کے گھٹنے پر رکھ دیا' انداز ایسا تھا جیسے اس کے قدموں پر گرنے والے ہوں۔ اس نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ جیسے بھی تھے' سخی داتا تھے۔ اسے اتنا دیا تھا' جتنی وہ توقع نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے برے وقت میں کام آئے۔ وہ ساری زندگی ساتھ رہنے کو کہہ رہے تھے۔ یہ عزت اور یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے کہ بڑھاپے میں بھی ایک جوان کمسن لڑکی کو خوش رکھا ہے' لیکن وہ کمسن لڑکی کیا کرے؟ کیا ادھوری بیوی بن کر رہے؟

وہ ایک ہاتھ سے سر کو تھام کر بولی۔ "آپ مجھے دوراہے پر لا رہے ہیں۔ آپ کے احسانات کے پیشِ نظر مجھے آپ کی عزت اور سماجی مرتبے کو قائم رکھنا چاہئے۔ میں آپ کے ساتھ رہ سکتی ہوں لیکن کب تک؟ میرے اپنے کچھ خواب ہیں۔ ان خوابوں کی تعبیر کیسے ملے گی؟"

"ہم تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ یہی گزارش کرتے رہیں گے کہ ہماری آخری سانسوں تک نہ چھوڑو۔ شریکِ حیات بن کر رہو۔ ایک بوڑھے کی دلجوئی کرتی رہو۔"

وہ چپ رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ ان کے حق میں جو بھی فیصلہ کرتی' وہ تہذیبی اعتبار سے غلط ہوتا اور وہ ایسی ہی غلطی کر کے ان کے احسانات کا بدلہ چکا سکتی تھی۔ اپنے والدین کو بھی آخری عمر میں آرام و آسائشیں دے سکتی تھی۔ ان تمام معاملات میں لازمی تھا کہ وہ اپنے آپ کو کچلتی رہے۔

وہ دونوں خاموش رہے۔ اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔ آدھی رات کے بعد غزل نے کہا۔ "آپ کو یوں زیادہ بیٹھنا نہیں چاہئے۔ بیڈ پر جا کر سو جائیں۔"

انہوں نے کہا۔ "مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میرا سر سہلاؤ۔ میرے کانوں میں رس بھری آواز گھولتی رہو۔ کچھ ایسا کرو کہ نیند آ جائے۔"

غزل نے زیرو پاور کا بلب آن کر کے دوسری لائٹیں بجھا دیں۔ دونوں بیڈ پر آ گئے۔ وہ لیٹ گئے۔ یہ سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ان کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ مجھے نہ دیکھیں۔ آنکھیں بند کریں اور سونے کی کوشش کریں۔"

انہوں نے آنکھیں بند کیں۔ سونے کے لئے آنکھیں بند کرو تو احساسات کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ایک حسین' نوخیز دوشیزہ قریب تھی۔ اس کے ہاتھ انہیں چھو رہے تھے۔ جسے پانے کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ وہ ابھی خیرات کی طرح مل رہی تھی۔ لیٹنے اور آنکھیں بند کرنے کے بعد بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے ایک ہاتھ اس پر یوں رکھا جیسے نیند میں وہاں ہاتھ پڑ گیا ہو۔

غزل نے یہی سمجھا۔ وہ خاموشی سے سر سہلا رہی تھی اور اپنے حالات پر غور کرتی رہی پھر اس نے دیکھا کہ ان کا وہ ہاتھ خوابیدہ نہیں تھا۔ لرزیدہ لرزیدہ تھا۔ بہت دھیرے

دھیرے اس پر پھسل رہا تھا۔ وہ بولی۔ "آپ سوئے نہیں؟ جاگ رہے ہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے کھسک کر قریب ہو گئے۔ اس سے لگ گئے۔ آنکھیں بہ دستور بند تھیں۔ بچہ نیند میں پیار کے لئے پکار رہا تھا۔ ایسے وقت غزل کے احساسات میں عورت کی فطری ممتا ہمکنے لگی تھی۔ وہ بوڑھا ایک بچے کی طرح اپنی طرف کھینچنے لگتا تھا۔ بعض اوقات عجیب دوغلے جذبات ہوتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر ڈانواں ڈول ہوتے رہتے ہیں۔

وہ پھر نامراد جذبوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی۔ بڑے کرب میں مبتلا ہونے لگی۔ اسی وقت بجلی چلی گئی۔ وہ زیرو پاور کا بلب بھی نواب صاحب کی طرح بجھ گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولے۔ "سامنے کارنس پر شمع دان رکھا ہوا ہے۔ ہم ابھی روشن کرتے ہیں۔"

بیڈ سے اتر کر اس سے دور ہو گئے۔ تاریکی میں کسی چیز سے ٹکرا نہیں سکتے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ اندھیرے میں ان کی آواز سنائی دی۔ "ہم نے موم بتی شمع دان سے الگ کر لی ہے۔ ماچس نہیں مل رہی ہے۔"

وہ واپس آ گئے۔ اسے تاریکی میں ٹٹول کر اس کے ہاتھ میں موم بتی تھما دی۔ "اسے پکڑو۔ ہم سرہانے کی میز پر ٹٹولتے ہیں۔ وہاں کسی دراز میں ماچس ہو گی۔"

میز کی درازیں کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں آئیں۔ ان کا وجود قریب ہی محسوس ہو رہا تھا۔ ماچس نہیں ملی۔ وہ بیڈ پر آ گئے۔ تھکے ہوئے انداز میں چاروں شانے چت ہو گئے۔ شاید ایک دوسرے سے بولنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا اس لئے تاریکی میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

وہ رات گزر گئی۔ غزل نے صبح اٹھ کر غسل کیا۔ نئی دلہن کے لئے سہاگ رات کے دوسرے دن کا ایک خاص لباس تھا۔ اسے پہن لیا۔ باتھ روم سے باہر آئی۔ نواب صاحب کمرے سے چلے گئے تھے۔ وہ سنگار کے میز کے سامنے بیٹھ کر ہیئر ڈرائیر سے بالوں کو خشک کرنے لگی۔ مہوش اور اسداللہ جان کی بیگم کمرے میں آ گئیں۔ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "سہاگ رات مبارک ہو۔ آپ نے اتنی جلدی غسل بھی کر لیا۔ لباس بھی پہن لیا۔ اب یہ سنگار ہمیں کرنے دیں۔ میں نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہوا ہے۔"

مہوش نے کہا۔ "میں بھی یہ کورس کرنا چاہتی تھی لیکن بچوں سے فرصت نہیں ملتی۔"

بیگم اسد اللہ جان نے مہوش سے کہا۔ "آپ بیڈ کی چادر اور تکیے کے غلاف بدل دیں۔ کمرا سیٹ کر دیں۔"

مہوش قریب سے بیڈ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ فوراً ہی وہاں پہنچ کر تکیوں کے غلاف اتارتے ہوئے بولی۔ "نواب صاحب کے بیڈ پر کبھی ایک چادر نہیں رہتی۔ ان کے مزاج کے مطابق چادریں بدلتی رہتی ہیں۔"

غزل نے کہا۔ "نواب صاحب کے مزاج کو آپ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ یہاں آپ اپنی بہن کے بیڈ کی چادریں بدلتی رہتی ہیں۔ بہن سے بڑے قصے سنے ہوں گے۔"

مہوش کو چپ لگ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نئی دلہن ایسا منہ توڑ جواب دے گی۔ وہ بستر کی چادر سمیٹ کر دوسری چادر لانے کے لئے کمرے میں چلی گئی۔ بیگم اسد اللہ جان نے کہا۔ "آپ کا جواب نہیں بھابی جان! وہ دم دبا کر بھاگی ہیں۔ انہیں تو آپ ہی اس کوٹھی سے بھگائیں گی۔ پچھلے چھ برسوں سے اپنے بچوں کے ساتھ یہاں ڈیرا جما رکھا ہے۔ نواب بھائی جان اپنی بیگم ماہ لقا کی خاطر انہیں برداشت کر رہے ہیں۔"

"رشتے داروں کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے آپ یہاں کتنے برسوں سے ہیں؟"

"میں..........؟" وہ گڑبڑا گئی۔ اسے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ سنبھل کر بولی۔ "ہماری تو اپنی کوٹھی تھی۔ اسد کو کاروبار میں نقصان ہوا تو وہ کوٹھی فروخت کر دی۔ یہاں کچھ دنوں کے لئے آئے تو نواب بھائی جان نے ہمیں روک لیا۔ ہم جانا چاہتے تھے۔ وہ ہمیں جانے نہیں دیتے۔" پھر ذرا مایوس ہو کر بولی۔ "اگر آپ نہیں چاہیں گی تو ہمیں جانا ہی ہو گا۔"

"میں بھلا کیوں اعتراض کروں گی۔ آپ ساری زندگی یہاں رہیں۔"

وہ خوش ہو گئی۔ غزل نے کہا۔ "نواب صاحب فرماتے ہیں' میں ایک گلاب ہوں۔ مجھے کانٹوں میں رہنا چاہئے۔"

اس کا منہ لٹک گیا۔ بات کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود انجان بن کر بولی۔ "بے شک' آپ تو گلاب سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ کالا ٹیکا ضرور لگایا کریں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ماہ لقا بھابی کو جا کر سلام کر لیں۔ وہ آپ سے بڑی ہیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ آئیں' چلیں۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر نچلی منزل کی طرف جانے لگیں۔ بیگم اسد اللہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں۔ "ماہ لقا بھابی تو اللہ میاں کی گائے ہیں۔ کسی کے منہ پر کچھ نہیں کہتیں۔ لحاظ کرتی ہیں۔ یہ دوسری تو پٹاخہ ہے۔ چٹاخ پٹاخ بولتی ہے۔ دانش مندی یہی ہو گی کہ کبھی اس کے منہ نہ لگا جائے۔"

بیگم ماہ لقا اپنے کمرے میں وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ غزل کو دیکھتے ہی خوشی سے بانہیں پھیلا کر بولیں۔ "آؤ دلہن! میں پیروں سے مجبور نہ ہوتی تو خود تم سے ملنے آتی۔"

وہ جھک کر اس سے گلے ملتے ہوئے بولی۔ "آپ بڑی ہیں۔ مجھے آپ کے پاس آنا چاہئے اس لئے آئی ہوں۔ جب بھی بڑی بہن کی حیثیت سے حکم دیں گی' آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہو جاؤں گی۔"

بیگم ماہ لقا ہمیشہ سے ملنسار تھیں۔ غزل بھی محبت کا جواب محبت سے دینا جانتی تھی۔ دونوں ذرا سی دیر میں گھل مل گئیں۔ غزل نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ ناشتہ کروں گی؟"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "اس گھر میں تمہاری پہلی صبح ہے۔ آج تمہیں نواب صاحب کے ساتھ کھانا پینا چاہئے۔"

"ہم دونوں ان کے ساتھ ناشتا کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو وہاں لے چلوں گی۔"

وہ ان کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ نواب صاحب انہیں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ماہ لقا سے بولے۔ "دیکھو' ہم کیسی دلہن لائے ہیں۔ تمہاری خدمت کرتے ہوئے نئی زندگی کی شروعات کر رہی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "آپ کی پسند' آپ کا انتخاب لاجواب ہے۔"

وہ تینوں میز کے اطراف بیٹھ کر کھانے پینے اور ہنسنے بولنے لگے۔ غزل کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک اونچے مہذب گھرانے میں خوب صورت' صاف ستھرا اور ہنستا بولتا ماحول مل رہا تھا۔ زندگی کے کتنے ہی روشن اور تاریک پہلو ہوتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کے ساتھ ایک نیا روشن پہلو دیکھ رہی تھی اور تاریک پہلو کو بھول رہی

تھی۔

وہ دن گزر گیا۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ آئندہ وہیں دن رات گزارنے تھے۔ نواب صاحب اس کے ایسے دیوانے تھے کہ فیکٹری جانا بھول گئے تھے۔ وہاں کے اہم کام ٹیلی فون کے ذریعے نمٹایا کرتے تھے۔ کبھی کاروباری میٹنگ میں ایک دو گھنٹے کے لئے جایا کرتے تھے۔ وہ ماہ لقا بیگم کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی تھی یا اپنے بیڈ روم میں تنہا پڑی رہتی تھی۔ کبھی صوفے پر بیٹھ کر کتابیں پڑھتی تھی۔ کبھی بیڈ پر لیٹ جاتی۔ بیڈ کے سامنے کارنس پر اس کی اور نواب صاحب کی فریم کی ہوئی تصویریں پڑی ہوئی تھیں۔ ان دونوں تصویروں کے درمیان ایک خوب صورت شمع دان رکھا ہوا تھا۔ ہر ماہ کے آخر میں محفل مشاعرہ منعقد کی جاتی تھی۔ اشعار پیش کرنے والے ہر شاعر کے سامنے باری باری وہ شمع دان رکھی جاتی تھی۔

جب وہ پہلی بار نواب صاحب کی اس کوٹھی میں ایک شاعرہ کی حیثیت سے آئی تھی تو وہ شمع دان اس کے آگے رکھ گیا تھا۔ اس کے کئی ماہ بعد وہ دلہن بن کر آئی تو وہی شمع دان اس کے سامنے کارنس پر رکھا ہوا تھا۔ وہاں پہلی رات جب بجلی گئی تو نواب صاحب بڑی سی موم بتی نکال لائے تھے۔ صبح اٹھ کر پھر اسے شمع دان میں رکھ دیا تھا۔ جب گلاس بھر کر پانی نہ ملے تو آدھے گلاس سے پیاس بجھ جاتی ہے۔ بجلی کی تیز روشنی نہ رہے' لوڈشیڈنگ ہونے لگے تو موم بتی کی مدھم روشنی سے بھی رات گزر جاتی ہے۔

وہ گزارا کر رہی تھی۔ موجودہ زندگی سے کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ نواب صاحب سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اب ان کے ساتھ آخری دم تک رہنا تھا۔ پتا نہیں پہلے کس کا دم نکلنے والا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بوڑھے رہ جاتے ہیں جوان دنیا سے اٹھ جاتے ہیں۔ عورت کی خوش قسمتی یہی ہے کہ بہت محبت کرنے والا اور کمانے والا جیون ساتھی ملے۔ اس حوالے سے وہ خوش نصیب تھی۔ محبت اور دولت دونوں ہی چھپر پھاڑ کر مل رہی تھیں۔

غزل ان کے ساتھ گھر سے باہر بھی جاتی تھی۔ تفریح کے لئے ملک سے باہر بھی گئی۔ لندن' پیرس اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ کو دنیا کے نقشے میں دیکھا تھا پھر قسمت مہربان ہوئی تو ان ممالک میں قدم بھی رکھا۔ انہیں آنکھوں سے دیکھا۔ نواب صاحب سے سمجھوتا کر

کے وہ دنیا کو دور تک دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ اس طرح پتا نہ چلا کہ ایک برس کیسے گزر گیا۔

نواب صاحب دھوم دھام سے شادی کی سالگرہ منانا چاہتے تھے۔ اپنے عزیز و اقارب اور دنیا والوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ انہوں نے جوانوں کی طرح ایک جوان لڑکی کے ساتھ ایک برس گزارا ہے۔ غزل نے اعتراض کیا۔

"دھوم دھام ضروری نہیں ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ میں آپ کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ ہم سال گرہ کی شام سمندر کے ساحل پر جائیں گے۔ تفریح کریں گے۔ رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھا کر گھر آئیں گے۔"

وہ مان گئے۔ اسے شاپنگ کرانے لے گئے۔ جب وہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے تو ہزاروں نہیں لاکھوں روپے کی شاپنگ کراتے تھے۔ ہیرے موتیوں کے زیورات ضرور خریدتے تھے۔ گویا اسے ہیرے موتیوں میں تولتے رہتے تھے۔ اس نے نواب صاحب سے سمجھوتا کر کے دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ آئندہ کبھی ان کا ساتھ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ دونوں شاپنگ کے بعد گھر لوٹ رہے تھے۔ نواب صاحب نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے رفتار سست کی پھر کہا۔ "ہماری طبیعت گھبرا رہی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "گاڑی فٹ پاتھ سے لگا کر روک دیں۔ آپ کو ڈرائیونگ نہیں کرنی چاہئے۔ میں ابھی فون کر کے ڈرائیور کو بلاتی ہوں۔"

وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولے۔ "فون نہ کرنا۔ ہم جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہیں لیکن اندر سے دل گھبرا رہا ہے۔ جب ہمارا کوئی نقصان ہونے والا ہو یا کوئی مصیبت آنے والی ہو تو اسی طرح دل گھبرانے لگتا ہے۔ ایسا ہماری زندگی میں کئی بار ہو چکا ہے۔"

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں شاپنگ کے لئے کبھی نہ آتی۔"

"ہم نے سوچا' تمہارے ساتھ گھومتے پھرتے رہیں گے تو دل بہلتا رہے گا۔ صبح سے ہماری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ ہمیں وارننگ دے رہی ہے اور ہم خود کو سمجھا رہے ہیں کہ بائیں آنکھ پھڑکنے سے کچھ نہیں ہوتا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ساتھ کچھ نہ

کچھ ہوتا رہا ہے۔"

"آپ کی باتیں سن کر میں پریشان ہو رہی ہوں۔ اللہ خیر کرے' میں گھر پہنچ کر صدقہ خیرات دوں گی۔ آپ نے مجھے صبح کیوں نہیں بتایا۔ آنے والی مصیبتوں کو روکا نہیں جا سکتا لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھ کر حاجت مندوں کی حاجت روائی کر کے مصیبتوں کو کم کیا جا سکتا ہے۔"

"بھئی' تم مجھ سے زیادہ پریشان ہو رہی ہو۔ ایسا بھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ آنے والے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔"

انہوں نے ایک گل فروش کی دکان کے سامنے کار روک دی۔ غزل کے لئے گجرے اور مالائیں خریدنے لگے۔ وہ ایک متوسط طبقے کا علاقہ تھا۔ بازار میں اچھی خاصی رونق تھی۔ وہ دوسری طرف کی کھڑکی کے باہر دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ کبھی وہ بھی ایسے علاقے میں رہتی تھی اور بڑی محتاجی کی زندگی گزارتی تھی۔ یہ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ اچانک عروج حاصل ہو گا اور اونچے طبقے میں پہنچ جائے گی۔"

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اونچے طبقے کی ایک بہت مہنگی کار میں ایک مہنگے جیون ساتھی کے ساتھ بیٹھی ہے۔

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا' پھر دوڑنے کے انداز میں تیزی سے اُدھر جانے لگی۔

نواب صاحب نے پریشان ہو کر آواز دی۔ "غزل! کہاں جا رہی ہو؟ رک جاؤ.........."

وہ ہاتھ اٹھا کر آوازیں دے رہی تھی۔ "سکندر.........! سکندر.........! رک جاؤ سکندر.........!"

نواب صاحب فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ دُور لوگوں کی بھیڑ میں وہ گم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی۔ اس نے ایک بار پلٹ کر اس دیوانی کو دیکھا۔ ان دونوں کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہو گا۔ راستہ صاف ہوتا تو وہ تیر کی طرح اس کے پاس پہنچ جاتی' لیکن ان کے درمیان لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ دھکے کھا کر کبھی پیچھے ہو رہی تھی' کبھی آگے بڑھ رہی تھی۔

اب وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے ٹکریں کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ بازار کی ایک گلی سے دوسری گلی میں جا رہی تھی۔ دوسری تیسری گلیوں میں

زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ وہ دُور تک دیکھ سکتی تھی لیکن جو آسمان سے اس کے لئے اتر کر آیا تھا' وہ زمین پر آ کر گم ہو گیا تھا۔

ایک خیال پیدا ہوا' کیا وہ فریب تھا؟

نہیں۔ یہ ماننے کے لئے وہ تیار نہیں تھی۔ اس نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ وہ تو لہو کی طرح اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا تھا۔ اسے پہچاننے میں اس کی نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ بازار بہت بڑا تھا۔ وہ ایک ایک دکان کے سامنے سے ہو کر گزرتی رہی۔ ایک ایک شخص کو توجہ سے دیکھتی رہی۔ بازار کے باہر بھیڑ نہیں تھی۔ پچھلے حصے میں تقریباً ویرانی تھی۔ وہاں نواب صاحب سے سامنا ہو گیا۔

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اس کی جستجو میں بھٹکتے رہے تھے۔ اس قدر پیدل چلنے کے عادی نہیں تھے' لیکن تھکن اور پریشانیوں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ وہاں کئی دکانیں بند تھیں۔ وہ ایک دکان کے چبوترے پر تھک کر بیٹھ گئے۔ غزل نے قریب آ کر دیکھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ اپنے پھیپھڑوں کے اندر سانس کھینچ رہے تھے۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے انہیلر کھول کر اسے ہلا رہے تھے پھر اسے منہ میں رکھ کر سانس کھینچ رہے تھے۔

وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ دیوانہ وار خود دوڑتی رہی تھی اور ایک بوڑھے کو بھی دوڑاتی رہی تھی۔ فی الوقت انہیں آرام آ گیا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے آرام سے سانس لے رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "ہماری گاڑی یہاں سے دور ہے۔ آپ وہاں تک نہیں جا سکیں گے۔ میں ڈرائیور کو فون کر کے بلاتی ہوں۔"

وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے سیدھے بیٹھ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ بے اختیار کس کے پیچھے بھاگتی رہی تھی؟ ایسی کون سی ہستی ہے' جس کے لئے وہ باؤلی ہو گئی تھی؟ وہ ہستی کس پہلو سے اس کے لئے اہمیت رکھتی ہو گئی؟

وہ ان لمحات میں نواب صاحب کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا' وہ یہیں کہیں ہو گا۔ شاید نواب صاحب کی وجہ سے چھپ گیا ہے۔ اگر وہاں اکیلی رہے گی تو شاید وہ سامنے آ جائے گا۔

وہ وہاں اکیلی نہیں آئی تھی اور یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نواب صاحب اسے وہاں تنہا چھوڑ کر چلے جاتے۔

پھر اسے کیسے تلاش کیا جائے؟ دل نہیں مان رہا تھا کہ اسے دوبارہ دیکھے بغیر اس سے باتیں کئے بغیر اور اسے ساتھ لئے بغیر وہاں سے چلی جائے۔ اب تو اس کے بغیر کھانا پینا اور سونا حرام ہو جائے گا۔

نواب صاحب تھکن اور کمزوری کے باعث آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ وہ انہیں سہارا دے رہی تھی۔ اسے ان کی حالت پر بھی ترس آ رہا تھا۔ ایسی حالت میں یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ گھر جائیں' میں بعد میں آ جاؤں گی۔

ایک بیمار بوڑھے کو راستے میں چھوڑ دینا' سراسر زیادتی ہوتی۔ وہ دونوں کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب اسٹیئرنگ سیٹ پر ہانپتے رہے اور سوچتے رہے۔ اس نے کہا۔ "آپ اچھی طرح آرام کر لیں پھر گاڑی چلائیں۔"

وہ بڑی نقاہت سے بولے۔ "ہم انتظار کر رہے ہیں کہ تم کچھ بولو گی' تمہیں بولنا چاہئے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ........... وہ میرے ایک عزیز تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہو گئے ہیں۔"

"اوہ........... تم یہ کہنا چاہتی ہو۔ ابھی جسے دیکھا ہے' وہ مر چکے تھے؟"

"میں اسی بات پر حیران تھی۔ بے اختیار ان کے پیچھے بھاگتی چلی گئی تھی۔"

وہ قائل ہو کر بولے۔ "ہم بھی کسی مردے کو زندہ دیکھ لیتے تو تمہاری طرح ہمارے اندر بھی تجسس پیدا ہوتا ہے۔"

انہوں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس نے کہا۔ "آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں امی ابو سے ملتی ہوئی جاؤں گی۔"

"ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم ان سے ملتے جائیں گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے پھر بولے۔ "تمہاری حیرانی' تمہارا تجسس بجا تھا لیکن اس طرح بازار میں دیوانہ وار بھٹکنا مناسب نہیں تھا۔ تم ہماری اور ہمارے خاندان کی عزت ہو۔ اگر ہمارا کوئی شناسا وہاں مل جاتا تو ہمیں بڑی شرمندگی

ہوتی۔"

انہوں نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ "تم بہت اچھی ہو۔ سمجھوتے کے مطابق بڑی محبتیں دے رہی ہو۔ ہم نے تمہیں ہر طرح کی آزادی دی ہے۔ اس کے عوض صرف ایک التجا کی ہے کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے ہماری عزت پر حرف آئے۔"

"مجھے افسوس ہے' میں اپنے اختیار میں نہیں تھی۔ بھول گئی تھی کہ میں نواب سعداللہ جان کی شریکِ حیات ہوں۔ آپ کی عزت اور عظمت قائم رکھنا میرا فرض ہے۔ آئندہ محتاط رہوں گی۔"

وہ اپنی کوٹھی میں آ گئی۔ آسیہ نے دروازے پر آ کر مسکراتے ہوئے ان دونوں کا استقبال کیا۔ اس کی امی اور ابو نے سلام کے جواب میں دونوں کو دعائیں دیں۔ اس کے نثار بھائی جان نے کہا۔ "ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ بڑی عمر ہے تمہاری۔ یوں بھی ہم تمہاری عمر درازی کی دعا کرتے رہتے ہیں۔"

وہ سب ایک دوسرے کے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس کی امی نے کہا۔ "آج تم نے صبح سے ایک بھی فون نہیں کیا۔ تھوڑی دیر پہلے تمہاری بھابی نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئی ہو۔"

اس پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس کے ابو نے پوچھا۔ "بیٹے! طبیعت ٹھیک ہے؟ بڑی چپ چپ سی لگ رہی ہو؟"

اس نے ماں کو مخاطب کیا۔ "امی...........!"

ماں نے اسے دیکھا۔ اس نے باپ کو مخاطب کیا۔ "ابو...........!"

"بولو بیٹے! کیا بات ہے؟"

"بات ایسی ہے کہ آپ سن کر یقین نہیں کریں گے۔ وہ........... وہ سکندر..........."

"سکندر؟" اس کی امی اور ابو نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ امی نے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ لڑکی آج گڑا مردہ کیوں اکھاڑ رہی ہے؟"

وہ بولی۔ "وہ........... ہم جنہیں مرحوم سمجھ رہے ہیں' وہ زندہ ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے سکندر کو دیکھا ہے۔"

ماں نے چونک کر نواب صاحب کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "ہوش میں تو ہو؟ کیا جاگتی

آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی ہو۔ بھلا کبھی مرنے والے بھی زندہ ہوتے ہیں؟"

نواب صاحب نے کہا۔ "غزل نے کسی کو دیکھا تھا۔ بھرے بازار میں اس کے پیچھے دوڑتی گئی تھیں لیکن وہ دکھائی نہیں دیا۔ کیا یہ نظروں کا دھوکہ نہیں ہو سکتا؟"

"ہرگز نہیں۔ میں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر دیکھا ہے۔ میری آنکھوں نے دھوکہ نہیں کھایا ہے؟"

اس کے ابو نے کہا۔ "بیٹے! یہ ممکن نہیں ہے۔ مرنے کے بعد کوئی زندہ نہیں ہوا۔ تم نے اسے کیسے دیکھ لیا؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ یہ مانتے ہیں؟"

"بے شک۔ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتی ہو؟"

"ابھی میں پاگل بھی نہیں ہوں۔ ہوش و حواس میں رہ کر بول رہی ہوں۔ آپ بتائیں' میں نارمل ہوں یا نہیں؟"

"تم نارمل ہو' ہوش مند ہو۔ سچ بولتی ہو لیکن انسان ہو دھوکہ کھا سکتی ہو۔"

وہ زچ ہو کر نواب صاحب کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے کہا۔ "میں اس معاملے میں کچھ نہیں بولوں گا۔ اس مرحوم کے والدین یا سگے رشتے داروں سے معلوم کیا جائے۔ غزل جو کہہ رہی ہیں' اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "مرحوم کا کوئی سگا سوتیلا نہیں ہے۔ وہ میرے مرحوم دوست کا بیٹا تھا۔ جب وہ لاہور سے آیا تو میں نے اسے سر چھپانے کی جگہ دی۔ ملازمت حاصل ہونے کے بعد وہ ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگا تھا۔"

"یہاں کسی نے تو مرحوم کی تجہیز و تکفین کی ہو گی۔ ان کا آخری دیدار کر کے انہیں قبر میں اتارا ہو گا؟"

وہ بولی۔ "ان کے دوستوں نے آخری رسومات ادا کی ہوں گی۔ ان کا تو کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے گھر آ کر مجھے ان کی موت کی اطلاع دی تھی۔"

"پھر تمہیں یقین کر لینا چاہیے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ اس کے دوست اطلاع دینے کے بعد واپس گئے ہوں تو وہ جی اٹھا ہو۔"

"اگر موت کے بعد اس کا جسم ثابت و سالم رہتا تو سوچا جا سکتا ہے کہ اسے عارضی موت آئی تھی۔ ڈاکٹروں نے جسم سے گولی نکال دی۔ اسے نئی زندگی مل گئی لیکن بم دھماکے سے اس کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے پھر وہ مجسم ہو کر اس دنیا میں کیسے آ سکتا ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "میں ایک ہی بات جانتی ہوں۔ میری آنکھوں نے دھوکہ نہیں کھایا ہے۔ ابو! آپ اور بھائی جان میرا ایک کام کر سکتے ہیں۔"

نثار نے کہا۔ "ہاں بولو۔ میں ابھی کروں گا۔"

"میں نے سکندر کو لیاقت آباد میں دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ اسی علاقے میں کہیں رہتے ہوں۔ وہ اب بھی وہاں کی مارکیٹ میں ہو سکتے ہیں۔ آپ دونوں وہاں جائیں۔ لیاقت آباد ڈاک خانے سے لے کر دس نمبر لالو کھیت تک انہیں تلاش کریں۔ میرا دل کہتا ہے' وہ ضرور دکھائی دیں گے۔"

اس کی امی نے کہا۔ "رات کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ تمہارے ابو بھوکے رہ کر اسے کب تک تلاش کرتے رہیں گے۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "آپ کو کھانے کی پڑی ہے۔ کیا ایک رات یہ باہر کھانا نہیں کھا سکتے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ تجسس کے مارے نہ مجھ سے کچھ کھایا جائے گا' نہ ہی مجھے نیند آئے گی۔"

اس کے ابو نے کہا۔ "ہم ابھی جا رہے ہیں۔ وعدہ کرو' ابھی نواب صاحب کے ساتھ کھانا کھاؤ گی اور بے فکری سے سوؤ گی۔ ہم ابھی اسے ڈھونڈیں گے۔ اگر نہ ملا تو کل صبح پھر وہاں جا کر اس کے دوستوں سے بھی ملیں گے اور اسے شام تک تلاش بھی کرتے رہیں گے۔"

نثار نے کہا۔ "میں سکندر کو صورت سے نہیں پہچانتا ہوں۔ کیا اس کی کوئی تصویر ہو گی؟"

غزل نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں۔ اوپر میری الماری میں اس کی تصویر ہے۔"

نواب صاحب اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نثار کے ساتھ اوپر اپنے کمرے میں آئی۔ الماری کو کھول کر اس کے اندر والے سیف کو کھولا۔ لوگ سیف

میں مال و دولت اور اہم دستاویزات چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس نے سکندر کی تصویر چھپا کر رکھی تھی۔ اس نے تصویر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان! آپ پچھلے ایک برس سے بے روزگار ہیں۔ میں نے آپ کو اور بھابی جان کو یہاں رہنے کی اجازت دی ہے۔ آپ بچوں کے ساتھ یہاں عیش و آرام کے ساتھ رہتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”تم میری پیاری بہن ہو‘ مجھ پر مہربان ہو۔ میں یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”آپ میرے احسان کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں تو کسی بھی طرح سکندر کو تلاش کریں اور اس سے میری ملاقات کرائیں۔“

”اگر یہ زندہ ہے تو صبح تک ضرور اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی کوٹھی زیرِ تعمیر ہے۔ اسے مکمل کرنے کے لئے ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ایک لاکھ روپے چاہتے ہیں تو سکندر کو میرے سامنے لے آئیں‘ یا مجھے اس کے پاس پہنچا دیں۔“

”میں اسے ڈھونڈ نکالنے کے لئے جان تک لڑا دوں گا۔“

”آپ کسی کو نہیں بتائیں گے کہ میں سکندر سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ تمہاری بھابی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔“

تب اسے پانچ ہزار دیئے۔ وہ لالچی بھائی کے مزاج کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ خوش ہو کر چلا گیا۔ اس کی امی نے کمرے میں آ کر کہا۔ ”بیٹی! پہلے تم صرف ہمارے گھر کی عزت تھیں۔ اب نواب صاحب کے خاندان کی بھی عزت ہو۔ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ ایک غیر مرد کے لئے پریشان ہوتی پھرو۔“

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ”وہ غیر نہیں ہیں۔ یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”تم نے ماضی میں غلطی کی تھی۔ اس غلطی کو پھر کیوں ہوا دے رہی ہو؟“

”امی! آپ کوئی نصیحت نہ کریں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ میرے میاں نے مجھے آزادی دے رکھی ہے۔ میں اب آزاد اور خود مختار ہوں۔ اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔“

”تم کتنی ہی آزاد اور خود مختار ہو جاؤ۔ میں تمہاری غلط آزادی پر ضرور ٹوکتی رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو کتنی عزت‘ کتنا بلند مقام دیا ہے۔ تم اپنی ایک حماقت سے

سب کو خاک میں ملا دو گی۔“

”میں حماقت کر رہی ہوں تو ذہانت کیا ہے امی؟ کیا یہ ذہانت ہے کہ بیٹی کے لئے بوڑھا داماد پسند کیا جائے؟“

ماں کے ذہن پر ایک گھونسا سا لگا۔ بیٹی کی بات سچ تھی‘ لیکن بہت زہریلی اور ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”بیٹا اگر کھوٹا سکہ نہ ہوتا۔ وہ ماں اور بہن کے سروں کا آنچل بنا رہتا تو میں تمہارے لئے ٹھونک بجا کر کسی قابل نوجوان کو پسند کرتی لیکن بد ترین حالات نے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا تھا‘ جہاں ہم نے دانستہ یا نادانستہ تمہیں نواب صاحب سے منسوب کر دیا۔“

وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ کوئی معقول جواب نہیں دے سکتی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں نے کبھی بہت زیادہ دولت حاصل کرنے کی آرزو نہیں کی۔ میری ایک ہی تمنا ہے تھی۔ سکندر عزت سے حلال روزی کمائے۔ مجھے تین وقت نہ سہی‘ دو وقت یا ایک وقت ہی کھلائے‘ میں اس کے ساتھ بڑے فخر سے اور بڑی آسودگی سے زندگی گزاروں گی۔“

اس کی امی اب بھی خاموش رہیں۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ بولی۔ ”آپ کی مخالفت اور سکندر کی بے راہ روی نے مجھے کیا دیا ہے؟ ایک بڑے اونچے محل میں ایک شو پیس بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں شیشے کے شوکیس میں رکھی ہوئی دلہن ہوں۔ جسے صرف دیکھا جاتا ہے۔ کبھی چھو لیا جاتا ہے لیکن اس کے جذبوں کو سمجھا نہیں جاتا۔ مجھے بہت مہنگی بنا دیا گیا ہے اور یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ جوتی کتنی ہی مہنگی ہو‘ وہ پیروں تلے ہی رہے گی۔“

”بس کرو غزل! مجھے باتیں نہ سناؤ۔ میں نہیں جانتی کہ تم کیا کرنے والی ہو۔ اب میں کچھ جاننا نہیں چاہوں گی۔ جو ہونا ہے‘ وہ سامنے ہی آئے گا۔“

وہ تیزی سے چلتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں۔ اس کمرے میں ایک آ رہا تھا‘ ایک جا رہا تھا۔ اس بار نواب صاحب آئے۔ چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ غزل نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”یہ سکندر کون ہے؟“

”ابو نے ڈرائنگ روم میں کہا تھا کہ وہ ان کے دوست کے بیٹے ہیں۔“

”ہم نے محسوس کیا بلکہ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ سکندر کے ذکر سے تمہارے ابو

کو تکلیف پہنچ رہی تھی۔ وہ تمہاری خوشی کے لئے یا تمہارے حکم کی تعمیل کے لئے جبراً تلاش کرنے گئے ہیں۔ تمہاری امی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی اُلجھن میں پڑ گئی ہوں۔"

"آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ سکندر کے دوبارہ جی اٹھنے کی خبر سے کسی کو خوشی نہیں ہوئی۔ صرف میں ہی انہیں ڈھونڈ نکالنے کے لئے باؤلی ہو رہی ہوں۔"

"ہاں۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں اور تمہارا یہ باؤلا پن ہمیں کاٹ رہا ہے۔"

"آپ کو یہ دیکھ کر بھی تکلیف ہو رہی ہو گی کہ سکندر کی تصویر صرف میرے پاس ہے۔ گھر میں کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے۔"

"تم بڑی بے باکی سے بول رہی ہو۔"

"سچ بات منہ چھپا کر شرمندگی سے کہی جاتی ہے یا پھر سینہ تان کر کہی جاتی ہے۔ جب سچ کہنا ہی ہے تو پھر بے باکی سے کیوں نہ کہوں؟ سکندر میری پہلی محبت ہیں۔"

انہوں نے ایسے چونک کر دیکھا جیسے اچانک نیند سے جاگ گئے ہوں۔ شبہ تو ہو رہا تھا لیکن وہ شبہ خواب خواب سا تھا۔ غزل نے اس خواب سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے صوفے پر پہلو بدلنے لگے۔ اٹک اٹک کر کہنے لگے۔ "تم .... تم ہماری.......... غیرت کو للکار رہی ہو؟"

"میں نے آپ کو زبان دی ہے کہ آپ کی عزت پر کبھی حرف نہیں آنے دوں گی۔ اگر میں آپ کی کوئی ایسی چیز دوسروں کے حوالے کروں جس سے آپ کی عزت پر آنچ آئے تو میرا یہ عمل آپ کی غیرت کے لئے چیلنج ہو گا۔"

"تمہاری محبت صرف ہمارے لئے ہونی چاہئے، لیکن تم اس سے محبت کا دعویٰ کر رہی ہو۔"

"میری محبت آپ کے لئے کیوں ہو گی؟ ہم یہاں محبت سے نہیں، سودے بازی سے رہتے ہیں۔ آپ مجھے زندگی کی آسائشیں دے رہے ہیں، اس کے بدلے میں دن رات آپ کی خدمت کرتی ہوں۔ آپ بیمار ہو جاتے ہیں تو تیمارداری کرتی ہوں۔"

"تیمارداری کے لئے نرسیں اور خدمت گزاری کے لئے کنیزیں مل جاتی ہیں۔ ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔ اسے سودے بازی نہ کہو۔"

"آپ نے بڑھاپے میں جوانی کا بھرم رکھنے اور سوسائٹی میں عزت بنائے رکھنے کے لئے مجھے ایک نمائشی بیوی بنا کر رکھا ہے۔ آپ نے مجھ سے قسم لی ہے کہ میں کبھی طلاق نہیں مانگوں گی۔ بے شک آپ مجھے چاہتے ہیں۔ میری آرزو کرتے ہیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر للچاتے ہیں۔ ایسے میں محبت نہیں ہوس پیدا ہوتی ہے۔ یہ مان لیں کہ آپ مجھ سے محبت نہیں، سمجھوتہ کر رہے ہیں۔"

انہوں نے دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ وہ حقیقت بیان کر رہی تھی، وہ اس حقیقت کو مان رہے تھے، لیکن زبان سے اقرار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شادی کے ایک برس بعد پہلی بار محسوس کر رہے تھے کہ اسے منکوحہ بنا کر غلطی کی ہے۔ اب اس سے رشتہ توڑنے کا مطلب یہی ہوتا کہ جوانی نے بڑھاپے کو ناک آؤٹ کر دیا ہے۔ وہ اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ایسی بات نہیں کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ تو ان کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ ان کے احساسات میں سمندر کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور اس سمندر سے پیاسے کو صرف شبنم ملی تھی۔ اس کی ایک لہر نے ہی انہیں اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔ انہیں لہرلہر مات کھانا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی ناز برداری اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی ایک ایک ادا ایسی تھی کہ اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ جیسے بھی ناز نخرے دکھائے، دور نہ جائے، ان سے لگی رہے۔ ایک طرح سے وہ ایک ہی برس میں اس کے عادی ہو گئے تھے۔

انہوں نے اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم ہماری محبت کو سودے بازی کہہ لو مگر ہم جانتے ہیں اور ہمارا خدا جانتا ہے کہ ہم تم سے کتنی محبت کرتے ہیں؟"

"آپ کہتے ہیں تو میں مان لیتی ہوں۔ آپ بھی مان لیں کہ میں آپ کی خدمت کرتی ہوں۔ آپ کی بوڑھی جوانی کا بھرم رکھتی ہوں تو اس کے پیچھے بھی محبت ہے۔ میں بڑی محبت سے آپ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں اور آپ جب تک چاہیں گے، آپ کا ساتھ دیتی رہوں گی۔"

انہوں نے اس کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ ہلکا سا دباؤ ڈالا جیسے اپنے دباؤ میں لانا چاہتے ہوں پھر کہنے لگے۔ "محبت کسی ایک سے ہوتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے

تمہیں ہم سے ہونی چاہئے۔ صرف ہم سے۔"

"آپ کو مجھ سے پہلے بیگم ماہ لقا سے محبت تھی۔ ماہ لقا سے پہلے جو حسینہ آئی اس سے محبت ہوئی۔ اس حسینہ سے پہلے جو آئی' اس سے بھی محبت ہوئی پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ محبت کسی ایک سے ہوتی ہے؟"

"ہم اپنا ماضی بھول چکے ہیں۔ صرف تمہیں یاد رکھتے ہیں۔ تم بھی بھول جاؤ اور صرف ہمیں یاد رکھو۔"

"جو محبت دل کی گہرائیوں سے کی جاتی ہے۔ وہ کبھی بھلائی نہیں جاتی۔ سکندر کو میرے دل و دماغ سے مٹانے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اب بھی میرے اندر سانس لے رہا ہے اور ہمیشہ سانسوں کی طرح میرے اندر بسا رہے گا۔"

انہوں نے شانے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس سے دور ہٹ گئے۔ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب تو انہیں سنجیدگی سے سوچنا تھا۔ اپنے حالات پر غور کرنا تھا اور خاطر خواہ نتیجے تک پہنچنا تھا۔

☆------☆------☆

کمرے میں تاریکی تھی۔ وہ سوئچ آن کر کے کمرا روشن کر سکتا تھا' لیکن انسان کبھی نہ کبھی زندگی کی رونقوں سے گھبرا جاتا ہے۔ کبھی کبھی مستقل نہ سہی' عارضی موت چاہتا ہے۔ مثلاً خاموشی چاہتا ہے جیسے موت خاموش کر دیتی ہے۔ چھپنے کے لئے تاریکی چاہتا ہے۔ جیسے موت دائمی اندھیرا کر دیتی ہے۔ دنیا والوں سے دور تنہائی چاہتا ہے۔ جیسے موت قبر میں تنہا کر دیتی ہے۔ وہ کمرا ایک قبر کی طرح تھا۔ وہ دنیا والوں سے دور تنہا تھا۔ اس نے تمام بتیاں بجھا کر اندھیرا بھی کیا تھا لیکن کھڑکی اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر کی کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔

وہ پورے ایک برس سے اسی طرح تنہائی کی آغوش میں اور بدنصیبی کے اندھیرے میں اپنی غزل سے منہ چھپا رہا تھا۔ منہ چھپانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا یا اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور وہ اپنا چہرہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

دراصل اسے ضمیر کی مار پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی جان حیات کو دیکھتا آ رہا تھا کہ وہ اپنے بدترین حالات سے کس طرح جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ کپڑے سلائی کرتی تھی۔ اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔ ٹیوشن کے ذریعے بھی کچھ کمانے کی کوشش کرتی تھی۔ مہنگائی اور دکھ بیماریاں جتنی شدت سے اس پر حملے کرتی رہتی تھیں' وہ اتنی ہی شدت سے ان کا دفاع کرتی تھی۔

اس کے برعکس وہ بے روزگاری اور تنگ دستی سے ہار گیا تھا۔ اس نے محنت مزدوری نہیں کی تھی کیونکہ محنت کرنے سے صرف دو وقت کی دال روٹیاں ہی ملتی ہیں۔ ہتھیار اٹھا لینے سے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا تھا۔ "اپنے لئے تو جانور بھی جی

لیتے ہیں جیسے تیسے زندگی گزار لیتے ہیں۔ یہ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ اس دنیا میں ایک ہی بار آکر جانا ہوتا ہے۔ اگر یہاں کی نعمتوں سے کچھ نعمتیں میں حاصل نہ کیں' تمام مسرتوں میں سے کچھ مسرتوں کو گلے نہ لگایا' زندگی کو معطر نہ کیا' حیات کو خوش رنگ لباس نہ پہنایا تو پھر اس دنیا میں آکر کیا کیا؟"

غزل اس سے لڑتی جھگڑتی تھی۔ اسے پیار سے سمجھاتی بھی تھی کہ وہ عزت سے حلال کی روزی حاصل کرے گا تو ٹھیک ورنہ وہ ذلت اور رسوائی کے راستے پر اس کے ساتھ نہیں چلے گی۔

وہ کبھی غصے سے اور کبھی پیار سے کہتا۔ "نیک نامی کے راستے پر تمہیں کیا مل رہا ہے؟ بڑھاپے میں ماں کی آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔ وہ کپڑے سلائی کرنے کے قابل نہیں رہی ہیں۔ اسکول کی ملازمت چلی گئی۔ ٹیوشن پڑھنے والے غریب بچے پچیس اور پچاس روپے سے زیادہ نہیں دیتے۔ باپ اسپتال میں ہے اور ماں گھر سے اسپتال تک دن رات دوڑتی رہتی ہے۔"

وہ کہتی تھی۔ "اتنی لمبی باتیں نہ کرو۔ یہ دیکھو ہم عزت سے جی رہے ہیں یا نہیں؟"

"واہ؟ کیا عزت سے جی رہے ہیں۔ پیسوں کے بغیر دوا نہیں' دوا کے بغیر علاج نہیں' علاج کے بغیر زندگی نہیں اور زندگی ملتی بھی ہے تو سسکتی ہوئی۔ کیڑوں مکوڑوں کی طرح زمین پر گھسٹتی ہوئی' حالات کے قدموں تلے کچلتی ہوئی۔ کیا انسانی زندگی ایسی ہوتی ہے؟"

ان دونوں کے نظریات مختلف تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے اپنے طریقے پر چل کر ایک ساتھ زندگی گزارتے۔ آگ اور پانی یکجا نہیں رہتے۔ یا غزل کو اس کی طرح آگ بن جانا تھا یا اسے غزل کی طرح ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے کی طرح رواں دواں رہنا تھا۔

وہ اپنے دوستوں کو غزل کے بارے میں بتایا کرتا تھا کہ وہ اپنے نام کی طرح خوب صورت ہے اور جتنی خوب صورت ہے' اتنی ہی خوب سیرت بھی ہے۔ وہ اور اس کے دوست خطرات سے کھیلتے رہتے تھے۔ سیاسی ہنگامے برپا کرتے رہتے تھے۔ تخریبی کارروائیوں کے ذریعے لوٹ مار کرتے تھے۔ کبھی ہزاروں لاکھوں کماتے تھے۔ کبھی پولیس کے لاکھ جوتے کھاتے تھے۔ وہ جس سیاسی پارٹی کے لئے کام کرتے تھے' اس پارٹی کے لیڈر

انہیں قانون کے شکنجوں سے نجات دلاتے تھے۔ ہر سیاسی واردات کرنے پر انہیں ہزاروں روپے بھی دیتے تھے۔

اس آگ اور بارود کے کھیل میں ایک گلاب کھل رہا تھا۔ غزل کے پیار کی ٹھنڈی چھاؤں اسے مل رہی تھی۔ اس کے دوست کہتے تھے۔ "یار تم خوش نصیب ہو۔ عورتیں ہماری زندگی میں بھی آتی ہیں لیکن جب کمائی نہیں ہوتی تو دوسرے کمانے والوں کے پاس چلی جاتی ہیں۔ تمہیں چاہنے والی صرف تمہیں چاہتی ہے۔ تمہاری کمائی پر لعنت بھیجتی ہے لیکن یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ اس کے گھر والے تمہیں داماد نہیں بنائیں گے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "وہ تمہیں صراطِ مستقیم پر چلانے کی ضد کرتی رہے گی اور تم چل نہیں پاؤ گے۔ جرائم کی دلدل میں پھنسنے کے بعد یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔"

اس نے ایک بار پارٹی لیڈر سے کہا تھا۔ "میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ایک سیدھی سادی ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے اکاؤنٹ سیکشن اور آپ کی پبلسٹی مہم میں کام کر سکتا ہوں۔ پلیز مجھے انڈر گراونڈ سے نکال کر ان شعبوں میں منتقل کر دیں۔"

پارٹی لیڈر نے کہا۔ "گھاس کھا گئے ہو۔ تم تھانے والوں کے ریکارڈ میں ہو۔ تم پر الزامات بھی آئے ہیں اور اخبارات میں تمہاری تصویریں شائع ہو چکی ہیں۔ ہم اپنی سیاسی پارٹی میں صرف ایسے افراد کو کارکن بناتے ہیں جو نیک نام ہوتے ہیں اور پُرامن شہری کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی نیک نامی سے ہماری سیاسی پارٹی نیک نام اور قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ تمہارے جیسا دہشت گرد ہمارے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آسکتا۔ تمہیں انڈر گراؤنڈ رہ کر ہی کام کرنا ہو گا۔"

اس نے کہا۔ "میں موجودہ روش نہیں چھوڑوں گا تو میری شادی نہیں ہو سکے گی۔ مجھے ایک شریف گھرانے کی لڑکی نہیں ملے گی۔ میں اس لڑکی کی خاطر اپنی زندگی کا رخ بدل دینا چاہتا ہوں۔"

پارٹی لیڈر نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ اگر تم پارٹی چھوڑ کر جاؤ گے تو اس کا مطلب ہو گا کہ ہمارے بہت سے اہم راز سینے میں چھپا کر جا رہے ہو۔ ہمارے مخالفین اور دیانت دار پولیس افسران کو تمہارے ذریعے معلوم ہو گا کہ ہمارے سیاسی مفادات کے لئے تم نے کب اور کہاں کیسی واردات کی ہیں۔"

"میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں کا کوئی راز کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"جب تم ہمارے نہیں رہو گے تو ہمارے رازوں کے امین کیسے رہو گے۔ فضول باتیں نہ کرو۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمیں چھوڑ کر جاتے ہی پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔ تمہیں ٹارچ سیل میں لے جائے گی اور تم جانتے ہو ٹارچ سیل کیا ہوتا ہے؟ وہاں تم موت مانگو گے، موت نہیں ملے گی۔ عذاب ملتے رہیں گے۔ ہم ضمانت پر تمہیں رہا کرانے نہیں آئیں گے۔ اگر اذیتیں برداشت کرتے ہوئے کتے کی موت مرنا چاہتے ہو تو ابھی جا سکتے ہو۔"

اس نے یہ سب باتیں غزل کو بتائی تھیں۔ اس نے پریشان ہو کر کہا تھا۔ "یہاں آپ کے لئے خطرہ ہے۔ پارٹی لیڈر بھی دشمن ہے۔ پولیس والے بھی دشمن ہیں تو ہم یہ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر، کسی دوسرے صوبے میں چلے جائیں گے۔"

اس نے کہا۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ پارٹی لیڈر اسلام آباد میں بیٹھا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں دہشت گرد ایک ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس ڈور کا آخری سرا پارٹی لیڈر کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ڈور کو ذرا کھینچے گا اور کہیں سے اندھی گولیاں آکر ہم دونوں کو چاٹ جائیں گی۔"

یہ ایسی مجبوریاں تھیں جنہیں دور کرنا ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ آنسو بہا سکتی تھی اس کے لئے دعائیں مانگ سکتی تھی لیکن اپنے محبوب کو سیاسی دہشت گردی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اس دوران میں سکندر کا مزاج بدل گیا تھا۔ وہ اپنا بدترین انجام برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنی محبت پر آنچ آئے، یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

اس دن سے وہ گہری سوچ میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ اس کا ضمیر اس سے تقاضے کرنے لگا کہ وہ خود غرض نہ بنے۔ اگر اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے تو اسے محبت کے سبز باغ میں نہ بھٹکائے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مال و دولت لاکر اس کے قدموں میں ڈال دے۔ وہ عزت اور نیک نامی کی زندگی چاہتی تھی۔ اسے کسی عزت دار گھرانے میں زندگی گزارنے کا موقع دے اور اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے۔

وہ سوچتا رہا اور اس سے دور ہو جانے کے خیال سے بے چین ہوتا رہا۔ اس کے

ساتھی غزل کے معاملے میں بہت مخلص تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ کسی بڑے گھرانے سے اس کے لئے رشتہ آیا ہے تو ان میں سے ایک نے کہا۔ "یار! ہم درندے ہیں۔ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ اپنے مفاد کی خاطر قصائی بن جاتے ہیں لیکن تمہاری محبت اور پریشانیاں دیکھ کر ہمیں بھی غزل پر پیار آنے لگا ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "ہم گناہ گار ہیں۔ طہارت کے بغیر قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اسے ہم دور سے دیکھ سکتے ہیں، عقیدت سے سر جھکا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم سب غزل کو دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے پیار کر سکتے ہیں اور دل سے جو پیار ہوتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ محبوب کو مٹی میں نہ ملایا جائے۔"

ایک اور ساتھی نے کہا۔ "ہمارا مشورہ ہے۔ اسے برباد نہ کرو، آباد کر دو۔ کسی عزت دار گھرانے سے رشتہ آیا ہے تو اسے عزت اور نیک نامی سے جینے دو۔"

غزل ایسی تھی کہ اس سے صرف محبت نہیں ہوتی تھی، عقیدت بھی ہو جاتی تھی۔ وہ دلدل میں رہنے والے بھی اس کی بھلائی چاہتے تھے۔ ان ہی دنوں میں تخریبی کارروائی کے دوران میں پولیس والوں سے کاؤنٹر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس روز غزل ایک بس میں بیٹھ کر اسپتال سے گھر جا رہی تھی۔ اس نے سکندر کو گولی لگتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اسے معلوم نہ ہو سکا کہ گولی کھانے والے پہ کیا گزری ہے۔ وہ اسے تلاش کرتی رہی تھی۔ اس کے ساتھی اسے سہارا دے کر ایک محفوظ پناہ گاہ میں لے گئے تھے۔ گولی اس کے پاؤں کو چھو کر گزر گئی تھی۔ ذرا سی کھال پھٹ گئی تھی۔ معمولی سی مرہم پٹی کے بعد خون رک گیا تھا۔ آرام آگیا تھا۔

ایک ساتھی نے اس پناہ گاہ میں آکر اطلاع دی کہ ان کے دو ساتھی ایک مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک بم کے پھٹنے سے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی لاشیں بھی پہچانی نہیں جا رہی ہیں۔ کسی بھی ساتھی کی حرام موت پر ان کے سر جھک جاتے تھے۔ ایک دن انہیں بھی ایسی ہی موت مرنا تھا۔ ایک ساتھی نے سکندر کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یار! ایک آئیڈیا ہے۔ غزل کو تمہاری موت کی خبر سنا دی جائے۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "یہ تمہیں کیا سوجھ رہی ہے؟ کیوں اس کا دل دکھانا چاہتے ہو؟"

"اس کی بھلائی چاہتے ہو تو اس کا دل دکھانا ہی ہو گا۔ اس سے دور ہونے کا اس کی زندگی سے نکل جانے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ غزل اس کے جیتے جی کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ یہ مر چکا ہے اور دنیا میں نہیں رہا ہے تو وہ ماں باپ کے فیصلے کے آگے سر جھکا لے گی۔ تم کیا کہتے ہو سکندر!"

وہ خلا میں تکنے لگا۔ وہاں غزل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ اسے جلد سے جلد ایک شاندار اور محفوظ مستقبل مل جائے۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "تم سب ٹھیک کہتے ہو۔ کسی بڑے گھرانے سے اس کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ ایسے رشتے بار بار نہیں آتے۔ مجھے فوراً ہی اس کی زندگی سے نکل جانا چاہئے۔"

بم دھماکے میں ان کے دو ساتھی اس طرح مارے گئے تھے کہ ان کے چہرے بھی سلامت نہیں رہے تھے۔ انہوں نے پلاننگ کے مطابق غزل کے دروازے پر پہنچ کر ماتمی خبر سنائی کہ سکندر بم دھماکے میں ہلاک ہو گیا ہے۔ زندگی کے شجر سے صرف سوکھے پتے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ کوئی سرسبز و شاداب پتا کبھی ٹوٹ کر نہیں گرتا۔ وہ غزل کی زندگی سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔

عجیب سوال کیا آندھیوں نے پتوں سے
شجر سے ٹوٹ کر گرنا بتاؤ کیسا لگا

وہ اپنی ترجمانی نہیں کر سکتا تھا کہ جیتے جی ٹوٹ کر کیسا لگ رہا تھا؟ پیار میں قربانی دے کر آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ چھپ چھپ کر اسے دیکھتا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ نواب سعداللہ جان سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ جس روز وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک شاندار کوٹھی میں منتقل ہوئی۔ سکندر خوشی سے روتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے خود غرضی سے اپنی چاہنے والی کو برباد نہیں کیا۔ فراخ دلی کا ثبوت دے دیا ہے۔ اپنی توقع سے زیادہ اس کی زندگی سنوار رہا ہے۔

ایک شہنشاہ نے اپنی محبوبہ کی رہائش کے لئے تاج محل نہیں بنایا تھا۔ اسے وہاں دفن کیا تھا۔ تاج محل خواہ کتنی ہی خوب صورت عمارت ہو، وہاں محبت کبھی زندہ نہیں پہنچی۔ سکندر نے غزل کو جس شاندار محل میں پہنچایا۔ وہاں بھی محبت مردہ ہو کر پہنچی۔

وہاں نواب صاحب کو اس کی سانس لیتی ہوئی لاش مل رہی تھی۔ ایسی ہستیاں ہی ہوتی ہیں جو مرنے کی بعد بھی زندہ زندہ سی لگتی ہیں۔

سکندر دیکھ رہا تھا کہ اس کی جان حیات نے ہیرے موتیوں سے جڑی ہوئی جوتیاں پہنی ہیں، لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جوتیاں اس پہننے والی کو کہاں سے کاٹ رہی ہیں۔ اوپر کی چمک دمک دیکھنے والے اندر کی گھناؤنی تاریکیاں دیکھ نہیں پاتے۔ سکندر کا ضمیر مطمئن ہو گیا تھا۔ عشق نے اسے آزمایا، وہ آزمائش پر پورا اتر گیا۔ اپنے پیار کی قربانی دے دی۔

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ محبت سے دستبردار ہونے کے بعد وہ محبت اور شدت اختیار کر رہی تھی۔ وہ غزل کے لئے مر چکا تھا اس لئے وہ صبر کر سکتی تھی، لیکن وہ سکندر کے لئے زندہ تھی اس لئے سکندر کو صبر نہیں آسکتا تھا۔ اس کے دور ہونے کے بعد وہ جیسے اور قریب آگئی تھی۔ کھلی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی اور اس سے ہنستی بولتی دکھائی دیتی تھی۔ اسے ایک رقیب کے حوالے کر کے اس نے دل کی بے چینی اور رات کے رت جگے خرید لئے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرنے والوں پر صبر آجاتا ہے۔ جینے والوں پر نہیں آتا۔ وہ کوشش کرتا رہا۔ اپنے آپ کو سمجھاتا رہا کہ آج نہیں تو کل اس کی یادیں کم ہو جائیں گی اور یادیں کم کرنے کے لئے وہ روز و شب کے ہنگاموں میں مصروف رہنے لگا۔ کسی طرح دن رات گزارنے لگا۔ دل کہتا تھا کہ ایک برس گزر چکا ہے۔ اب وہ عیش و آرام کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس جیسے گمراہ اور بے روزگار عاشق کو بھلا چکی ہے۔ اب کبھی سامنا ہو گا تو وہ اسے نہیں پہچانے گی۔ پہچان بھی لیا تو کار کی کھڑکی سے دیکھتی ہوئی گزر جائے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بازار سے گزرتے وقت اس کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ اس کا نام لے کر اسے پکار رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر اسے تعجب سے دیکھا۔ وہ اس سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تھی۔ مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ وہ فوراً اس کے قریب نہیں آسکتی تھی۔ وہ پلٹ کر اس سے دور بھاگتا چلا گیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی قربانی رائیگاں چلی جائے۔ وہ اس کے لئے مر چکا تھا۔

دوبارہ اس کی زندگی میں زہر گھولنے کے لئے واپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ اس سے چھپتا چھپاتا ہوا بازار کی گلیوں سے گزرتا ہوا ایک زینے سے پہلی منزل میں پہنچ گیا۔ وہاں دکانوں کے آفس اور مال کے گودام تھے۔ وہاں کے لوگوں سے اس کی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ وہ چھپنے کے لئے ایک دفتر میں آگیا۔ دکان کے مالک نے اسے دیکھتے ہی اٹھ کر مصافحہ کیا۔

"آؤ سکندر! کیا بات ہے؟ ہانپ رہے ہو۔ پسینہ پسینہ ہو رہے ہو۔ کیا پھر پولیس والے پیچھے پڑ گئے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل پولیس والوں سے اچھی نبھ رہی ہے۔"

"پھر پریشانی کیا ہے؟"

"میری ایک کزن مجھے تلاش کر رہی ہے۔ میں تمہارے گودام میں جا رہا ہوں۔ کوئی لڑکی بھی مجھے پوچھنے آئے تو کہہ دینا' نہ میں یہاں آیا ہوں اور نہ ہی تم مجھے جانتے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ ساتھ والے ایک بڑے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں دکان کا مال بھرا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہاں تقریباً دو گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ بڑی محبت سے سوچتا رہا۔ وہ بار بار نگاہوں کے سامنے آ رہی تھی اور بھیڑ میں دھکے کھاتی ہوئی اسے پکار رہی تھی۔ ایک دم اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ مرد تھا' شہ زور تھا' بڑی بے دردی سے آگ اور خون کی ہولی کھیلتا تھا۔ اسے آج تک ماں باپ کی موت نے بھی نہیں رلایا تھا' لیکن اس پیار کرنے والی کی دیوانگی نے اسے رُلا دیا۔ یہ سوچ کر خوشی سے آنسو نکلے جا رہے تھے کہ اونچے محل میں عیش و عشرت سے رہنے والی اپنے غریب عاشق کو بھلا نہیں پائی ہے۔

وہ صرف خوشی سے نہیں ندامت سے بھی رو رہا تھا کہ وہ اس کے پیار کی قدر نہ کر سکا۔ اس کے لئے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نہ لا سکا۔ اس چاہنے والی کی بہت معمولی سی آرزو تھی کہ وہ عزت اور نیک نامی سے روزی حاصل کرے۔

بہت چھوٹی سے آرزو تھی لیکن اس کے پیچھے بڑے طوفان چھپے ہوئے تھے۔ وہ جس دلدل میں پھنسا ہوا تھا وہاں سے نکلنا چاہتا تو اس کے ساتھ اسے محبتیں دینے والی بھی ماری جاتی۔ وہ اس کی آرزو کے مطابق نیک نامی کے راستے پر نہیں آسکتا تھا۔ اسے نیک نامی اور عروج دینے کے لئے بس ایک ہی راستہ تھا اس لئے وہ اس کی دنیا سے مر چکا تھا۔

اسے یقین تھا کہ وہ اسے کبھی ڈھونڈ نہیں پائے گی۔ وہ اتنی بلندی پر پہنچ گئی ہے کہ چھوٹے علاقوں میں کبھی نہیں آئے گی۔ اس سے کبھی سامنا نہیں ہو گا۔ وہ مر چکا ہے۔ وہ اس کا چہرہ کبھی دیکھ نہیں پائے گی۔

آخر سامنا ہو ہی گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا کہ کیا کرے؟

کرنا تو یہی تھا جو پچھلے ایک برس سے کرتا آ رہا تھا۔ وہ اس کے لئے مر چکا تھا۔ اسے پھر سے زندہ نہیں ہونا تھا' لیکن ایک طویل عرصے کے بعد عین نگاہوں کے سامنے اس کا مکھڑا دیکھ کر دل میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔ ماضی میں اس کے ساتھ گزارے ہوئے پیار بھرے لمحات اسے جھنجھوڑ رہے تھے۔ اسے اپنی طرف پکار رہے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"آؤ! کہ میں اب بھی تمہاری ہوں۔ میری آنکھیں اب بھی تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں اور ڈھونڈ کر پہچان رہی ہیں۔ میں آئینے میں خود کو دیکھ کر بھول سکتی ہوں لیکن تمہاری صورت کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔"

وہ دروازے پر دستک سن کر خیالات سے چونک گیا۔ وہ گودام کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر سے اس گودام کا مالک کہہ رہا تھا۔ "سکندر! کب تک چھپے رہو گے۔ دو گھنٹے گزر چکے ہیں اب میں گودام اور دفتر بند کر کے جانا والا ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسے ڈھونڈنے والی اتنی دیر بھٹکنے کے بعد واپس چلی گئی ہو گی۔ وہ اپنے مکان میں آ گیا۔ اس نے دو کمروں کا ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس کے دو ساتھی دوسرے کمرے میں رہتے تھے۔ اس وقت وہ تنہا تھا۔ کمرے کا بلب روشن کر سکتا تھا لیکن اندھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں تاریکی ہو' تنہائی ہو اور کوئی بولنے والا نہ ہو تو یادیں بولنے لگتی ہیں۔ جن یادوں کو وہ بڑی مشکلوں سے تھپک تھپک کر سلا رہا تھا۔ اب وہ اس کی سماعتوں میں چیخ رہی تھیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ آج صرف ایک ہی نظر اس پر ڈالی تھی۔ ایک ہی لمحے کا دیدار ہوا تھا۔ بس وہی ایک لمحہ اسے تڑپا رہا تھا۔ راکھ میں دبی ہوئی چنگاری سلگ رہی تھی۔ وہ آگ بننے والی بھی شعلہ بن کر بھڑکنے والی تھی۔ وہ اس سے کترا کر' بھاگ کر چلا آیا تھا لیکن وہ آگ اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ گھبرا کر سوچنے لگا' کیا محبت سے دی ہوئی قربانی رائیگاں چلی جائے گی۔ کیا میں اس کے سامنے جا کر

اس کا عیش و آرام، اس کا سکھ چین، اس کی عزت اور نیک نامی سب کو خاک میں ملا دوں گا؟

"نہیں.......... کبھی نہیں۔" وہ مٹھیاں بند کرنے اور کھولنے لگا۔ اپنے اندر اپنے آپ سے جنگ کرنے لگا۔

اس کے تین ساتھی بھی آگئے۔ ایک نے دروازے پر سے پوچھا۔ "تم نے اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟"

دوسرے ساتھی نے آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ کا ایک بٹن دبایا۔ کمرا روشن ہو گیا۔ تیسرے ساتھی نے پوچھا۔ "یہ اندھیرے میں اِدھر سے اُدھر پریڈ کر رہے تھے۔ کوئی پریشانی ہے؟"

وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ ایک ساتھی نے کہا۔ "بیٹھو نہیں اٹھو۔ ہم نہاری روٹی کھانے جا رہے ہیں۔ چلو وہیں باتیں ہوں گی۔"

وہ ان کے ساتھ باہر آگیا۔ تنہائی میں اس کی یادیں ستا رہی تھیں۔ دوستوں کے ساتھ رہ کر خود کو بہلایا جا سکتا تھا۔ وہ باہر سے دروازے کا تالا لگا کر ان کے ساتھ ایک گلی سے گزرنے لگا۔ ایک ساتھی نے کہا۔ "میں بہت عرصے کے بعد تمہیں کچھ پریشان دیکھ رہا ہوں۔ کیا پھر کسی سے عشق ہو گیا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اس جیسی نہ کوئی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔ تم سب اچھی طرح جانتے ہو۔ میں کبھی کسی عورت کو تنہائی میں آنے نہیں دیتا۔ میں نے اس کے بعد کسی کی تمنا کی ہے اور نہ کروں گا۔"

اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ "واقعی تم سچے عاشق ہو۔ اس کے لئے قربانی دینے کے بعد تمہیں کبھی کسی دوسری کی طرف مائل ہوتے نہیں دیکھا۔"

دوسرے ساتھی نے پوچھا۔ "کیا وہ تمہیں یاد آ رہی ہے؟"

"یہ نہ پوچھو۔ آج تو غضب ہو گیا۔ اس سے میرا سامنا ہو گیا تھا۔"

وہ سب چلتے چلتے رک گئے۔ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ وہ پہلی بار ماضی کی طرف کروٹ بدل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ میں اس بھیڑ سے گزر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی

آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔"

ایک نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ڈیفنس میں رہتی ہے۔ سوسائٹی کے مہنگے علاقے میں اس کا میکا ہے۔ وہ تیس لاکھ روپے کی کار میں گھومتی ہے، پھر وہ ایسے علاقے میں کیسے آ گئی؟"

سکندر نے کہا۔ "میں بھی حیران ہوں۔ اسے تقدیر کا تماشا کہنا چاہئے۔ میں اب تک اس سے چھپ کر رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر سامنا ہو ہی گیا۔"

ایک ساتھی نے پوچھا۔ "تمہیں زندہ دیکھ کر وہ حیران ہوئی ہو گی؟ تم سے بہت سوالات کئے ہوں گے؟"

"میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اسے دیکھتے ہی منہ چھپا کر بھاگتا ہوا ماجد بھائی کے گودام میں جا کر چھپ گیا۔"

"یار! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟ تمہیں تو اس کی خیر خیریت معلوم کرنی چاہئے تھی؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس کے لئے میں مر چکا ہوں۔ تم ہی لوگوں نے میری موت کی خبر اسے سنائی تھی۔ ہم اس کی بہتری چاہتے ہیں۔ اس لئے میں اسے زندہ دکھائی نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"اس طرح بھاگ آنے سے کیا اسے یقین آ جائے گا کہ تم دوبارہ مر چکے ہو؟"

وہ بے بسی سے بولا۔ "اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بس ایک ہی بات میرے دماغ میں تھی کہ میں نے جو قربانی دی ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔ میں اس کے لئے مر چکا ہوں لہٰذا اس کی نظروں سے مجھے گم ہو جانا چاہئے۔"

ایک ساتھی نے تائید کی۔ "یہ تم نے اچھا کیا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں دیکھ کر بھی تمہارے زندہ ہونے کا یقین نہ کرے۔ اس نے ایک نظر تمہیں دیکھا ہے۔ وہ اسے فریبِ نظر بھی سمجھ سکتی ہے۔"

سکندر نے کہا۔ "وہاں سے بھاگ آنے کے بعد میں خدا سے یہی دعا کر رہا ہوں کہ وہ مجھے فریب سمجھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے۔"

ایک اور ساتھی نے کہا۔ "وہ کوئی نادان بچی نہیں ہے۔ تم نے اس کے بارے میں

ہمیں بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ تمہاری دیوانی ہے۔ اس قدر دولت مند ہونے کے بعد بھی اس نے تمہیں یاد رکھا ہے۔ وہ مغرور نہیں ہے' تمہارے لئے پاگل ہے۔ اس نے اپنی عزت اور اونچے مقام کی پروا نہیں کی۔ بھرے بازار میں تمہارا نام لے کر پکارتی رہی۔"

دوسرے نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یار! ایسی چاہنے والی لڑکیاں خوش قسمتوں کو ملتی ہیں۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

وہ بڑے مستحکم لہجے میں بولا۔ "میں اسے بدقسمت نہیں بناؤں گا۔ اس کی نظروں سے دور رہوں گا اور کبھی اس کے سامنے نہیں آؤں گا تو کوئی میرا نام لے کر اسے بدنام نہیں کرے گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم اس سے مل لیتے تو اچھا ہوتا۔ اب وہ نہیں مانے گی کہ تم مر چکے ہو۔ وہ تمہیں تلاش کرتی رہے گی۔ کیا اس طرح اس کے سسرال والے اس پر شبہ نہیں کریں گے؟ کیا وہ بدنام نہیں ہوگی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "وہ مجھے تلاش نہ کرے تو اچھا ہے۔ ویسے وہ بہت سمجھ دار ہے۔ بدنامی کا کوئی راستہ اختیار نہیں کرے گی۔"

وہ سب ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے نہاری اور روٹیاں لانے کا آرڈر دیا۔ پھر اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ سکندر سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتی رہے گی۔ ابھی تھک ہار گئی ہوگی کل پھر آئے گی۔ اگر میں نظر نہ آؤں گا تو میرے ان ساتھیوں میں سے کوئی اسے نظر آ سکتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے مجھ تک پہنچنا چاہئے گی اور پتا نہیں کتنے لوگوں سے میرا پتا پوچھتی پھرے گی؟"

ان کے سامنے نہاری روٹیاں آ گئیں۔ وہ کھانے لگے۔ سکندر سے پوچھنے لگے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

وہ دوراہے پر تھا۔ ایک طرف دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا کہ وہ پھر اس کے بازوؤں میں آ جائے گی۔ دوسری طرف عشق کا جذبہ کہہ رہا تھا کہ وہ جس مقام پر پہنچ گیا ہے وہاں سے نیچے نہ آئے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ بازار کی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اب وہاں خرید و

فروخت کرنے والے نہیں تھے۔ اکا دکا لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ نثار احمد کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ابو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں بازار کی گلیوں سے گزرتے رہے' تمام دکانیں بند تھیں۔ صرف ہوٹل اور پان سگریٹ کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ہوٹل کے سامنے آ کر رک گئے۔ اس کے ابو نے کار سے اترتے ہی ہوٹل کے اندر دور بیٹھے ہوئے سکندر کو دیکھ لیا' پھر انہوں نے پریشان ہو کر اپنے بیٹے نثار کو دیکھا۔ وہ ہوٹل کے اندر جانا چاہتا تھا۔ باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں نہیں ہے۔ آگے چلو۔"

اس نے کہا۔ "ابو! ہوٹل میں اچھی خاصی بھیڑ ہے۔ آپ گاڑی میں بیٹھیں میں اندر دیکھ کر آتا ہوں۔"

"اندر نہ جاؤ۔ میں یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔ اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ ہزاروں کی بھیڑ میں اسے پہچان سکتا ہوں' وہ یہاں نہیں ہے۔"

وہ باپ کی بات مان کر پھر گاڑی میں بیٹھنا چاہتا تھا۔ اسی وقت سکندر کھانا کھانے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ دھونے کے لئے ایک نلکے کی طرف جانے لگا۔ نثار احمد نے اسے دیکھتے ہی فوراً جیب سے تصویر نکالی پھر اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابو! وہ دیکھیں سکندر نلکے کے پاس ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اسے جانے دو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ سمجھ لو کہ اسے دیکھا نہیں ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اسے گھنٹے بھر سے تلاش کر رہے ہیں۔ اب وہ نظر آیا ہے تو اس سے کترا کر جانا چاہتے ہیں۔"

وہ بولے۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ ہم تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد یہاں سے ناکام ہو کر جائیں گے اگر وہ نظر بھی آئے گا تو میں اس سے کترا جاؤں گا۔ اسے مخاطب نہیں کروں گا۔"

"آپ کیوں اس سے کترا رہے ہیں؟ کیا یہاں سے جا کر غزل سے جھوٹ کہیں گے؟"

"ہمیں اس کی موت کی خبر ملی تھی۔ غزل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ مر چکا ہے۔ اب

بھی اسے یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اس کی نظریں دھوکا کھا گئی تھیں۔ وہ زندہ نہیں ہے۔"

"آپ اس سے کیوں جھوٹ بولنا چاہتے ہیں؟ آپ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں؟"

"بیٹے! بڑی شرم کی بات ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کو اور بہو کو یہ بات معلوم ہو۔ خدا کے لئے یہ بات اپنے تک ہی رکھنا' بہو کو نہ بتانا۔ غزل اس لفنگے کو بہت چاہتی ہے۔ یہ دہشت گرد ہے۔ مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے۔ ہم نے غزل کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ اسے دل سے نکال دے' لیکن وہ کسی اور سے شادی کے لئے راضی نہیں ہو رہی تھی۔ خدا ہمیں بدنامیوں سے بچا کر نیک نامی دینا چاہتا تھا۔ پتا نہیں اس کی موت کی جھوٹی خبر کیسے غزل تک پہنچ گئی!" انہوں نے سوچ کر کہا۔ "ہاں.......... یاد آیا۔ اس کے دوستوں نے ہی دروازے پر آکر خبر دی تھی۔ اس لئے غزل کو اس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ ان حالات میں ہم نے اسے نواب صاحب سے شادی کے لئے راضی کر لیا۔ اب تم ہی سوچو۔ یہ پھر سکندر کے پیچھے باؤلی ہونے لگے گی تو کیا نواب صاحب یہ بے حیائی برداشت کریں گے؟"

نثار احمد سوچنے لگا۔ "ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ نواب صاحب اپنے اس رقیب کو برداشت نہیں کریں گے۔ غزل کو جتنا عروج ملا ہے' اتنا ہی زوال مل سکتا ہے لیکن مجھے کسی کے عروج و زوال سے کیا لینا ہے۔ غزل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں سکندر کو ڈھونڈ نکالوں گا تو وہ مجھے ایک لاکھ روپے دے گی اور میں ہر حال میں یہ ایک لاکھ روپے وصول کروں گا۔"

اس نے کہا۔ "ابو! مجھے ایک لاکھ روپے کی سخت ضرورت ہے۔ میں غزل کو سکندر سے ملاؤں گا تو وہ مجھے ایک لاکھ کی رقم دے گی۔"

"اس رقم پر لعنت بھیجو۔ بہن کو بدنامی اور بربادی سے بچاؤ۔"

"آپ مجھے ایک لاکھ روپے پر لعنت بھیجنے کا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی نظروں میں روپے پیسے کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی' اسی لئے مفلسی اور محتاجی کی زندگی گزارتے رہے ہیں۔ میں نے کسی کا محتاج بن کر رہنا نہیں سیکھا۔"

"بکواس مت کرو۔ کیا تم بہن کے محتاج نہیں ہو۔ پچھلے ایک برس سے بچوں سمیت اس کے گھر میں پڑے ہوئے ہو۔ اس کی دولت سے عیش کر رہے ہو۔ تم نے ماں باپ

کے حقوق ادا نہیں کئے۔ ہمیں کچرے کی طرح اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دیا۔ اب جس بہن کے سہارے جی رہے ہو اور عیش کر رہے ہو' اس کی بہتری کے لئے میری بات مان لو' یہاں سے چلو۔"

"میں نقصان اٹھانے والی کوئی بات نہیں مانتا۔ غزل کے پاس کیش ہو گا تو یہاں سے جاتے ہی مجھے ایک لاکھ روپے مل جائیں گے ورنہ کل بینک کھلنے کے بعد یہ رقم ضرور میرے ہاتھ آئے گی۔"

یہ کہتے ہی وہ ہوٹل کے اندر جانے لگا۔ باپ حیرت سے سوچتا رہ گیا۔ کیا میرے بیٹے کا خون سفید ہو چکا ہے؟ یہ ماں کا دودھ پی کر ماں کو بھول جاتا ہے۔ باپ کی کمائی سے پروان چڑھنے کے بعد باپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ پچھلے ایک برس سے بہن کا نمک کھا رہا ہے۔ اب اس سے نمک حرامی کرنے جا رہا ہے۔ ہمیں پہلے سے کیوں نہیں معلوم ہوتا کہ اولاد ایسی ہو گی۔ اگر معلوم ہوتا تو ہم کبھی پیدا نہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہمیں بیٹے پیدا کرنے کی سزا ملنی چاہئے۔

سکندر اور اس کے ساتھی کاؤنٹر پر آکر کھانے کا بل ادا کر رہے تھے۔ نثار نے اس کے قریب آکر مخاطب کیا۔ "سکندر!"

سکندر نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ دوسرے ساتھی بھی اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ "میں تنہائی میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا ایک طرف آ جاؤ۔"

سکندر نے پوچھا۔ "تنہائی میں کیا باتیں کرو گے؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

وہ ذرا قریب ہو کر دھیمی آواز میں بولا۔ "میں غزل کا بڑا بھائی ہوں۔"

سکندر ایک دم چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے سن لیا تھا کہ وہ آنے والا غزل کا بڑا بھائی ہے۔ اس نے کہا۔ "ہمارے ابو' تمہارے انکل باہر کھڑے ہیں۔"

ان سب نے باہر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کار کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ سکندر تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل کے باہر ان کے پاس آیا' پھر انہیں سلام کر کے ان کے گلے سے لگ گیا۔ وہ سکندر کو چاہتے تھے لیکن موجودہ حالات کا تقاضا تھا کہ اسے گلے نہ لگائیں مگر

مصلحتاً گلے لگانا بھی ضروری تھا۔ سہولت اور میل محبت سے بیٹی کے شاندار مستقبل کو تحفظ دینا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ تم کیسی زندگی گزار رہے ہو؟ مجھے اسپتال میں معلوم ہوا تھا کہ تم مجرمانہ زندگی گزارنے لگے ہو۔ پھر پتہ چلا کہ تم مارے گئے ہو اور اب دیکھ رہا ہوں کہ تم زندہ کھڑے ہو۔"

وہ پھر ان کے گلے لگ گیا۔ گلے لگنے کے بہانے آہستگی سے کان میں بولا۔ "انکل! غزل کی بہتری اسی میں ہے۔ اسے یہی معلوم ہونا چاہئے کہ میں مر چکا ہوں۔"

انہوں نے الگ ہو کر اسے حیرانی سے دیکھا پھر بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا تم اس کی بہتری چاہتے ہو؟ مگر......... مگر تم تو اس کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔"

"آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ایک اونچے گھرانے سے اس کا رشتہ آیا ہے تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے ذلت اور رسوائی نہیں دوں گا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اپنی موت کی خبر اسے پہنچا دی۔ میں جانتا تھا کہ جب تک اس کی دنیا میں' میں زندہ رہوں گا تو وہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کرے گی۔"

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹے! تم بہت عظیم ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت غلط رائے قائم کی تھی۔ تم اسی طرح سے دور رہو گے تو میں تمہارا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔"

"میں نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کر رہا ہوں تو یہ آپ میں سے کسی پر احسان نہیں کر رہا ہوں جو میرا ضمیر کہہ رہا ہے' وہی کر رہا ہوں۔"

اس کے ساتھی نثار احمد کے ساتھ ان کے قریب آ گئے۔ نثار احمد نے سکندر سے کہا۔ "تمہارے خیالات بہت اچھے ہیں لیکن تم غزل سے نہیں ملو گے تو وہ کبھی تسلیم نہیں کرے گی کہ اس نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقین سے کہہ رہی ہے کہ اس کی آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ ہم یہاں سے جا کر جھوٹ کہیں گے کہ تمہیں تلاش نہیں کر سکے تو وہ مشتعل ہو جائے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ بات اس کے خاوند تک پہنچے' لیکن اس کے اشتعال میں آنے سے بات بگڑ جائے گی۔"

باپ نے ناگواری سے دیکھ کر کہا۔ "وہ میری بیٹی ہے۔ وہ ناراض ہو گی تو میں اسے سمجھا منا لوں گا۔ تم اس معاملے میں نہ بولو۔"

"کیوں نہ بولوں؟ اس نے جب سے سکندر کو دیکھا ہے تب سے ہم سب کے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ ہم اسے تلاش کریں۔ وہ کتنی ضدی ہے۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر ہم یہاں سے ناکام ہو کر جائیں گے تو وہ اس کی تلاش میں خود نکل پڑے گی پھر کیا نواب صاحب سے ساری باتیں چھپی رہ سکیں گی؟"

وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر اس کے ابو نے کہا۔ "میں ابھی جا کر اسے سمجھاؤں گا۔ میری کوشش ہو گی کہ وہ مان جائے۔ سکندر سے ملنے کی ضد نہ کرے۔ اگر وہ نہیں مانے گی تو پھر میں چاہوں گا کہ وہ فون کے ذریعے تم سے باتیں کرے۔ کیا تمہارا کوئی فون نمبر ہے؟"

اس کا کوئی فون نمبر نہیں تھا۔ نثار احمد نے سکندر سے کہا۔ "تم میرا موبائل فون رکھ لو۔ جب وہ سنے گی کہ میں نے اپنا یہ فون تمہیں دے دیا ہے تو خوش ہو جائے گی۔ وہ میری لاڈلی بہن ہے۔ میں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس نے اپنا موبائل فون اسے دے کر کہا۔ "ہم جا رہے ہیں' کسی وقت بھی تم سے فون پر رابطہ ہو سکتا ہے۔"

سکندر نے اس سے اور اس کے ابو سے مصافحہ کیا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ اس کے ابو نے کہا۔ "تم اتنے خود غرض اور کمینے کیوں ہو؟"

وہ بولا۔ "ابو! اب میں بچہ نہیں ہوں کہ مجھے ماریں گے اور گالیاں دیں گے۔ آپ ناحق طیش میں آ رہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے' ہم سب غزل کا دیا کھاتے ہیں۔ ہم عمر میں اس سے بڑے ہیں تو کیا ہوا؟ ہمیں اس کے حکم پر عمل کرنا چاہئے۔ وفاداری اور نمک حلالی کا تقاضا ہے کہ ہم اس کی ہر خوشی پوری کرتے رہیں۔"

"تم کتنے وفادار اور کتنے نمک حلال ہو' یہ باپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ افسوس......... میں انسان پیدا کرنا چاہتا تھا' شیطان پیدا ہو گیا۔"

☆=====☆======☆

اس نے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی ہارن بجاتے ہوئے کار روک دی۔ وہ جانتا تھا کہ غزل ان کی واپسی کا شدت سے انتظار کر رہی ہو گی۔ ہارن سنتے ہی نواب صاحب سے معذرت کرتے ہوئے باپ اور بھائی سے ملنے آئے گی۔

بات ایسی تھی کہ نواب صاحب کے سامنے نہیں ہو سکتی تھی۔ غزل موقع محل دیکھ کر ان کے پاس آسکتی تھی۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے۔ آسیہ بچوں کو سلا کر وہاں آئی تھی۔ اپنی ساس کے سر میں تیل ڈال کر مساج کر رہی تھی۔ شوہر اور سسر کو دیکھ کر بولی۔ "آپ نے اتنی رات کر دی۔ ہم بڑی دیر تک انتظار کرتے رہے پھر کھانا کھا لیا۔ میں ابھی کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ نثار سے اس کی امی نے پوچھا۔ "اس کا کچھ پتا چلا؟"

نثار نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اپنے مطلب کے مطابق سوال کیا۔ "غزل کہاں ہے؟"

غزل نے زینے کے اوپری حصے سے کہا۔ "بھائی جان! آپ یہاں آجائیں۔"

وہ بڑی فرمانبرداری سے بولا۔ "جی.......... ابھی آیا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا زینے کے ایک ایک دو دو پائیدان پھلانگتا ہوا اس کے قریب پہنچتے ہی رازدارانہ انداز میں بولا۔ "میں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ تم وعدے کی پکی ہو۔ مجھے ایک لاکھ روپے دو گی نا؟"

"ہاں.......... ابھی چیک دوں گی۔ پیسوں کی بات نہ کرو۔ ان کی باتیں کرو۔"

"ابو تو اسے دیکھ کر کترا رہے تھے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس آکر جھوٹ بول دوں کہ وہ مر چکا ہے' لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اپنی بہن سے جھوٹ نہیں بولوں گا' اس کا دل نہیں توڑوں گا۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "آپ کیوں باتیں بنا رہے ہیں؟ میں کہہ رہی ہوں' صرف ان کی باتیں کریں۔"

"میں اسی کی باتیں کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا پتا نہیں تمہیں اس سے روبرو ملنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔ اس لئے میں نے اپنا موبائل فون اسے دیا ہے۔ اس سے کہہ دیا ہے کہ تم اس سے کسی وقت بھی باتیں کر سکتی ہو۔ وہ تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہو گا۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "بھائی جان! آج آپ نے میرا دل جیت لیا ہے۔ آپ وہ فون نمبر بتائیں۔"

وہ جیب سے قلم نکال کر اپنی دوسری جیبوں میں کاغذ تلاش کرنے لگا۔ وہ اس کے ہاتھ سے قلم لے کر بولی۔ "آپ نمبر بتائیں۔"

نثار نمبر بتانے لگا۔ وہ ہتھیلی پر لکھنے لگی۔ پھر اسے قلم دے کر بولی۔ "میں جا رہی ہوں۔ نواب صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ میں جانے سے پہلے آپ کو چیک دے کر جاؤں گی۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں آئی۔ نواب صاحب اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ وہ اِدھر سے اُدھر جا کر رک جاتے تھے پھر اِدھر سے اُدھر آکر رک جاتے تھے۔ حالات ٹھوکریں مار رہے تھے اور وہ رکنے کے باوجود اپنی انا اور خودداری سے دور کسی سمجھوتے تک پہنچے تھے۔ پھر اس سمجھوتے سے منکر ہو کر اپنی انا کی طرف لوٹ آئے تھے۔ گھڑی کے پنڈولم کی طرح کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں پا رہے تھے۔ غزل کو دیکھتے ہی ٹھہر گئے۔

ان سے نظریں ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا۔ انہوں نے کہا۔ "تم تو ہارن کی آواز سنتے ہی چونک گئی تھیں۔ ہم اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ تمہارے کھوجی واپس آگئے ہیں۔"

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر بولے۔ "کیا واقعی وہ زندہ ہے؟"

اس نے جھکے ہوئے سر کو "ہاں" کے انداز میں ہلایا۔

انہوں نے پوچھا۔ "کیا وہ یہاں آیا ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا پھر پوچھا۔ "تم اس سے ملنا چاہو گی؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "پہلے فون پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو.........."

"برا ماننے کا احساس ہوتا تو تم سکندر کو ہمارا رقیب نہ بناتیں۔ وہ زندہ ہے اسے دفن نہیں کیا گیا مگر تم اس کی محبت کو دفن کر سکتی تھیں۔ اب بھی کر سکتی ہو لیکن نہیں کرو گی۔"

"آپ پھر وہی بحث چھیڑ رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں، کبھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ سکندر سے اتنی راز داری سے ملاقات کروں گی کہ آپ کی عزت پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ہماری شریکِ حیات ہو۔ ہمیں بے غیرتی کا احساس ہو رہا ہے۔"

"ہم دنیا والوں کے لئے میاں بیوی ہیں۔ میں حقیقتاً آپ کی صرف خدمت گار اور آپ کا بھرم رکھنے والی ایک وفادار ساتھی ہوں۔ آپ نہ میرے شوہر ہیں اور نہ آپ کو بے غیرتی کا احساس ہونا چاہئے۔"

"یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ اس پر ہر پہلو سے غور کرنا ہوگا پھر ہم کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ یہاں سے چلو۔ اپنے گھر میں باتیں ہوں گی۔"

"پہلے میں اس سے فون پر بات کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، کرو۔"

وہ کمرے سے جانے لگی۔

انہوں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ کیا اپنے میکے والوں کو یہ تاثر دینا چاہتی ہو کہ ہمیں اُلو بنا کر یہاں بٹھا کر وہاں اپنے عاشق سے باتیں کر رہی ہو؟"

"میں کوٹھی کے باہر لان میں جا کر فون کروں گی۔"

"تم مجھے یہاں چھوڑ کر تنہا لان میں جاؤ گی؟ خدا کے واسطے مجھے تماشہ نہ بناؤ۔ یہاں میرا سر نہ جھکاؤ۔ یہاں سے چلو۔ راستے میں رک کر کہیں باتیں کر لینا۔"

اس نے اپنے پرس میں سے چیک بک نکال کر ایک لاکھ روپے کا چیک لکھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ رقم کسے دے رہی ہو؟"

"میں نے بھائی جان سے وعدہ کیا تھا، وہ سکندر کو ڈھونڈ نکالیں گے تو میں انہیں ایک لاکھ روپے دوں گی۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ کتنے لالچی ہیں۔"

"وہ تو لالچی ہیں، لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تمہارا وہ چاہنے والا کتنا مہنگا ہے۔ اسے صرف چند گھنٹے تلاش کرنے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے.........."

"ایک لاکھ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر وہ نہ ملتے تو میں انہیں ڈھونڈ نکالنے کے لئے

جان بھی دے دیتی۔ میں ڈھونڈنے نکلوں گی یا جان دے دوں گی تو آپ کی عزت پر حرف آئے گا۔ آپ حساب کر لیں کہ سکندر کس قدر مہنگے ہیں۔"

وہ گھور کر اسے دیکھتے رہے۔ اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئے۔ غزل نے کہا۔ "امی! ہم جا رہے ہیں پھر کسی دن آئیں گے۔"

"بیٹی! تم نے اور نواب صاحب نے کھانا نہیں کھایا۔ کچھ تو کھا پی لو۔"

نواب صاحب نے کہا۔ "ابھی بھوک نہیں ہے۔ ہم پھر کسی دن آ کر کھالیں گے۔"

غزل نے نثار کو چیک دیا۔ پھر نواب صاحب کے ساتھ آ کر کار میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بولے۔ "تم ہماری موجودگی میں فون نہیں کرو گی؟"

وہ خاموش رہی۔ وہ تھوڑی دور تک ڈرائیو کرتے رہے پھر بولے۔ "اب ہم کہاں گاڑی روکیں؟ تمہیں گاڑی میں تنہا چھوڑ کر کہاں جائیں؟"

"آپ گھر چلیں۔ وہاں ہمارے اوپر کے پورشن میں کوئی نہیں آتا ہے۔ میں کسی کمرے میں بیٹھ کر باتیں کر لوں گی۔"

وہ کوٹھی میں آ گئے۔ نواب صاحب بیگم ماہ لقا سے باتیں کرنے چلے گئے۔ وہ اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ ہتھیلی پر لکھا ہوا نمبر یاد ہو گیا تھا۔ دل میں نقش ہو گیا تھا۔ اس نے پھر بھی اسے ڈائری میں لکھ لیا۔ اس کے بعد رابطہ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو.......... میں سکندر بول رہا ہوں۔"

اس گمشدہ آواز کو سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہو گئیں۔ وہ ایک ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟"

وہ چپ رہا۔ وہ بولی۔ "کیا میں نے بے وفائی کی تھی؟ پیار میں کوئی کمی کی تھی؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے غلط نہ سمجھو۔ تم عزت اور نیک نامی سے زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔"

"میں ایسی زندگی آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ایک بزدل کی طرح منہ چھپا کر چلے جائیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھ سے دل بھر گیا تھا۔ میں پرانی ہو گئی تھی۔"

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔

اس نے کہا۔ "ہوس بدلتی ہے۔ محبت نہیں بدلتی۔ تم سدا بہار ہو۔ تم پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ تم کبھی پرانی نہیں لگو گی۔ خدا کے لئے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"تمہیں کیا سمجھوں؟ میں نے اپنا تن من سب کچھ تمہیں سونپ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم مجھے اٹھا کر دوسرے کے قدموں میں پھینک دو۔"

"میں نے تمہیں پھینکا نہیں ہے۔ تمہاری زندگی سنواری ہے۔"

"واہ کیا سنوارنا ہے۔ تراشیدم میں نے تراشا.......... پرستیدم.......... میں نے پوجا کی۔ شکستم میں نے توڑ دیا۔ آپ نے تو ایسا توڑا ہے کہ میں کبھی خود کو سمیٹ نہیں پاؤں گی۔ ایک بات سچ بتائیں' کیا مجھے دل سے بھی نکال دیا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اس دل سے تم اس وقت نکلو گی' جب یہ دھڑکنا بھول جائے گا۔ میں نے تمہارے بغیر یہ ایک برس کیسے گزار رہے ہیں' یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔"

"کیا یہی آپ کا دل ہے؟ اتنے عرصے کے بعد جھوٹے منہ بھی ملنے کی بات نہیں کر رہے ہیں۔"

"تم ایک عزت دار گھرانے کی بہو بن چکی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم کوئی غلط قدم اٹھائیں اور تمہاری عزت اور شان و شوکت خاک میں مل جائے۔"

"مجھے خود سے زیادہ نواب صاحب کی عزت کا خیال ہے۔ آپ میرے گھر پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ آج بھی آسکتے ہیں۔ کسی کو اعتراض نہیں ہو گا کیونکہ اب وہ میری اپنی کوٹھی ہے۔ میرا اپنا گھر ہے۔"

"میں تو ابھی اڑتا ہوا وہاں پہنچ جاؤں گا لیکن یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ بات تمہارے سسرال والوں سے چھپی نہیں رہے گی کہ تم مجھ سے چھپ کر ملتی ہو۔"

"میں سسرال والوں سے' میکے والوں سے اور تمام دنیا والوں سے تنہا نمٹ سکتی ہوں۔ آپ ایک گھنٹے بعد میرے میکے والی کوٹھی میں آجائیں۔ میں آپ کو پتہ بتاتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ پچھلے ایک برس سے تمہیں چھپ چھپ کر دیکھتا رہا ہوں۔"

یہ بات سن کر وہ مسرتوں سے بھر گئی۔ اس نے کہا۔ "میں ایک گھنٹے بعد اپنی کوٹھی میں آؤں گی۔ فون بند کر رہی ہوں۔ نواب صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فون بند کروں؟"

"ٹھیک ہے۔ میں آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے فون بند کرنے کے بعد سوچا۔ پھر انٹر کام کے ذریعے نواب صاحب کو مخاطب کیا۔ "میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ہم ماہ لقا کے پاس ہیں۔ ابھی آتے ہیں۔"

وہ بیگم ماہ لقا کے پاس نہیں تھے۔ ایک کمرے میں تنہا تھے۔ انہوں نے اپنے سسرال فون کیا تھا۔ غزل کی امی نے فون اٹینڈ کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "ہم نثار احمد سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے نثار کی آواز سنائی دی۔ "جی نواب صاحب' بندہ حاضر ہے۔ آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ آپ مجھے بھی خدمت کا موقع دیا کریں۔"

"ہم خدمت کا ہی موقع دے رہے ہیں۔ آپ سکندر کا فون نمبر بتائیں۔"

"میرا ہی فون نمبر ہے۔ آپ نوٹ کریں۔"

اس نے نمبر بتائے۔ انہوں نے نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ "اپنی امی اور ابو وغیرہ کو سمجھا دیں کہ وہ غزل کو ہماری اس فون کال کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ آپ سے ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے عرض نہیں سنی۔ رابطہ ختم کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ غزل کسی ملازمہ کے ذریعے انہیں بلا لے گی۔ ان کا اندازہ درست تھا۔ اس نے فون کے ذریعے انہیں بلایا۔ اس کا مطلب تھا' سکندر سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اب اس کا فون انگیج نہیں ہو گا۔ انہوں نے اس کے نمبر پنچ کئے پھر انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

وہ بھاری بھرکم آواز میں بولے۔ "ہم بول رہے ہیں نواب سعداللہ جان۔ غزل کے شوہر نامدار۔ ہم مختصر گفتگو کریں گے۔ ہم نہیں جانتے' تم اس کی زندگی سے کیوں دور ہو

گئے تھے؟ تمہاری دوری نے اس کی زندگی سنوار دی ہے۔ اسے جو عروج حاصل ہوا ہے' اسے خاک میں ملاؤ گے؟"

وہ چپ رہا۔ غزل سے باتیں کرنے کے بعد وہ کشمکش میں تھا کہ ایک گھنٹے بعد اس سے ملاقات کرنے کے لئے اس کی کوٹھی میں جانا چاہئے یا نہیں؟ وہ جتنی بھی محتاط رہے گی' ان کی ملاقاتیں سسرال والوں سے نہیں چھپیں گی اور اب ملاقات سے پہلے ہی اس کا مجازی خدا اس سے بہت اہم سوال کر رہا تھا۔

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "نواب صاحب! میں اسے کسی عزت دار گھرانے میں پہنچانے کے لئے اس کی زندگی سے مر گیا تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے آپ جیسے ہی نیک انسان کی ضرورت ہے۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ آپ کا سوال میرے لئے آسان ہے۔ آپ کے لئے مشکل ہے۔"

"ہمارے لئے کیوں مشکل ہے؟"

"آپ کو غزل کے کردار پر شبہ ہو گیا ہے۔ کیا پھر میرے دور ہو جانے کے بعد آپ اسے پہلے کی طرح محبت اور عزت دیں گے؟"

"خدا گواہ ہے' ہم اسے جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ ہم ماضی کی غلطیوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اسے مستقبل میں وفا شعار رہنا چاہئے۔ تم یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو اس کی تمام محبتیں اور وفاداریاں ہمارے نام ہو جائیں گی۔"

"میں آج بھی اس قابل نہیں ہوں کہ اسے عزت اور نیک نامی دے سکوں۔ یہ آپ ہی دے سکتے ہیں۔ میں نے اس لمحے میں مستحکم فیصلہ کر لیا ہے۔ میری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ میں پھر اس کی زندگی سے گم ہو جاؤں گا۔"

سکندر نے فون بند کر دیا۔ وہ ایک کمرے میں تھا۔ اس کے ساتھی اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے کہا۔ "میں نے دوسری طرف کی باتیں نہیں سنیں' تیری باتوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس نواب کو تیرے اور غزل کے عشق کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے اور وہ پھر بھی اس کو اپنی بیوی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "تم اب تک اس کے لئے مردہ تھے۔ بار بار مردہ نہیں بن سکتے۔

وہ اب کبھی تمہاری جھوٹی موت کا یقین نہیں کرے گی۔ تمہارے پیچھے بھاگتی رہے گی۔ تم کچھ عرصہ کے لئے یہ شہر چھوڑ دو۔"

تیسرے ساتھی نے کہا۔ "ابھی ایک بجا ہے۔ اخبار کا وہ صحافی تین بجے دفتر سے باہر آتا ہے۔ ایسے ہی وقت اسے گولی مارنی ہے۔ اس کے بعد ہم پارٹی لیڈر کو راضی کریں گے کہ وہ تمہیں یہاں سے اسلام آباد بلا لے۔"

"آج میرا جی نہیں چاہتا کہ کوئی واردات کروں۔ آج میں نے ایک برس بعد اس کی آواز سنی ہے۔ اس سے باتیں کی ہیں۔ میرے اندر محبت ہی محبت بھری ہوئی ہے۔ میں نفرت کا کوئی کھیل نہیں کھیلنا چاہتا۔"

ایک نے کہا۔ "ہماری ڈیوٹی رنچھوڑ لائن میں ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہے۔ اگر ہم تیرے ساتھ ہوتے تو یہ واردات نہ کرتے۔ تمہیں پاشا اور مجیدے کے ساتھ جانا ہے۔"

وہ تینوں اٹھ گئے۔ اپنے اپنے ہتھیار چیک کر کے انہیں اپنے لباس کے اندر چھپا کر وہاں سے چلے گئے۔ صحافی جسیم الدین پچھلے کئی برسوں سے ان کی سیاسی پارٹی کے خلاف لکھ رہا تھا۔ اسے خریدنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ بکنے والا صحافی نہیں تھا۔ پارٹی کے خلاف بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ کالم لکھتا رہتا تھا۔ ابتدا ہی سے اس کا نام پارٹی کی بلیک لسٹ میں تھا۔ اب حکم صادر ہوا کہ سکندر' پاشا اور مجیدا اسے قتل کریں گے اور اس کے قلم کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیں گے۔

سکندر نے غزل کو دلاسا دیا تھا کہ وہ ایک گھنٹے بعد ملاقات کرنے اس کی کوٹھی میں آئے گا۔ وہ اپنی جانِ حیات کو ذلت اور رسوائی کی طرف لانے والا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ فی الحال ملاقات کے سلسلے کو ٹالنا چاہتا تھا پھر غزل کے لئے نواب صاحب کی محبت اور نیک ارادوں کا علم ہوا تو اس نے آخری فیصلہ کر لیا کہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے گم ہو جائے گا۔

غزل اس سے ملنے کے لئے ایک گھنٹے کے اندر اپنے میکے جانا چاہتی تھی۔ نواب صاحب نے کہا۔ "ابھی آئی ہو اور ابھی جانا چاہتی ہو۔ بات کیا ہے؟"

وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "سکندر وہاں امی اور ابو سے ملاقات کرنے آ رہے ہیں۔ میں بھی ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے' آپ مجھے جانے سے نہیں روکیں گے۔"

"ہماری بات مانو گی تو ہم نہیں روکیں گے۔ جانے سے پہلے سکندر کو فون کرو۔ اس سے پوچھو وہ تمہاری کوٹھی میں آرہا ہے یا نہیں؟"

ایک گھنٹہ گزرنے والا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے اسے فون پر مخاطب کیا۔ وہاں پاشا اور مجیدا ایک جیپ میں اسے لے جانے آئے تھے۔ اس نے ان سے کہا۔ "ذرا ایک منٹ' میں بات کرلوں پھر چلتا ہوں۔"

پھر اس نے فون پر کہا۔ "غزل! میں ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم ذرا انتظار کرو۔ میں اپنے فون پر تمہارا فون نمبر پڑھ کر یاد کر چکا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد خود ہی تمہیں کال کروں گا۔"

وہ فون بند کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں آکر بیٹھ گیا۔ پاشا اسے ڈرائیو کرتے ہوئے اخبار کے دفتر کی طرف جانے لگا۔ مجیدے نے سکندر سے کہا۔ "بڑے ٹھاٹھ ہیں تمہارے۔ موبائل فون رکھنے لگے ہو۔ کسی معشوق سے باتیں کر رہے تھے۔"

"سوری' یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اپنے کام کی طرف دھیان دو۔"

"مجھے اپنا کام کیسے کرنا ہے۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مگر تم عشق محبت کے چکر میں ہمارا کام خراب کر سکتے ہو۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ کوئی ساتھی کام بگاڑتا ہے تو میں اسے.........."

پاشا نے ڈانٹ کر کہا۔ "مجیدے! تجھے کئی بار سمجھایا ہے۔ کام کے وقت جھگڑا نہ کیا کر۔ تجھ سے نشہ برداشت نہیں ہوتا تو دم کیوں لگاتا ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نشہ کرنے کے بعد ہی مخالفوں کو کتوں کی موت مارتا ہوں۔ دیکھ لینا تم دونوں سے پہلے میری ہی گولی اسے لگے گی۔"

وہ اخبار کے دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔ صحافی جسیم الدین آخری کاپی پریس میں بھیجنے کے بعد تین بجے رات کو دفتر سے نکلتا تھا۔ پارکنگ ایریا میں آکر اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے گھر جاتا تھا۔

پاشا نے کہا۔ "سکندر! تم پارکنگ ایریا میں جاؤ۔ وہاں چھپ کر رہو۔ اگر میرے اور مجیدا کی فائرنگ سے وہ بچ کر بھاگنا چاہے تو تم اسے نشانہ بناؤ گے۔ اسے بچ کر نہیں جانا چاہئے۔"

سکندر پارکنگ ایریا میں آگیا۔ وہاں کئی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک گاڑی کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تین بج رہے تھے۔ وہ صحافی کسی وقت بھی آسکتا تھا۔ سکندر یہ فیصلہ کرتا آرہا تھا کہ اس صحافی کو مرنے نہیں دے گا۔ آخری بار ایک سچے صحافی کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے گا۔

اس نے فون کے ذریعے قریبی تھانے کے انچارج سے رابطہ کیا۔ "ہیلو.......... میں ایک ضروری اطلاع دے رہا ہوں۔ ابھی اخبار کے دفتر کے باہر پارکنگ ایریا میں فائرنگ ہونے والی ہے۔ معروف صحافی جسیم الدین کو قتل کیا جائے گا۔ وقت کم ہے' آپ فوراً یہاں پہنچیں۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "ہیلو! تم کون ہو؟ تمہیں یہاں آنا چاہئے۔"

"میں یہیں پارکنگ ایریا میں ہوں۔ آپ فوراً آجائیں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

اپنے لباس کے اندر سے ایک ریوالور نکال کر انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ کے بعد ہی وہ صحافی دکھائی دیا۔ ہیلمٹ پہنتا ہوا اپنی بائیک کی طرف آرہا تھا۔ سکندر نے غزل کے فون نمبر پنچ کئے اور اُدھر دیکھتا رہا جہاں پاشا اور مجید لنگڑا جا کر چھپے ہوئے تھے۔ پاشا اپنی جیپ کے پیچھے تھا اور مجیدا لنگڑا ایک ہوٹل کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوا تھا۔

فون پر غزل کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو.......... سکندر!"

اس نے کہا۔ "ہاں' میں بول رہا ہوں۔ موت کے سامنے کھڑا ہوں۔ ابھی تمہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہو تم؟"

"میری جان! میں نے ایک بار موت کا ناٹک کیا۔ اب یہ ناٹک نہیں ہو رہا ہے۔ موت سے جنگ ہو رہی ہے۔ فون آن رکھو اور آوازیں سنتی رہو۔"

جسیم الدین اپنی بائیک کے قریب پہنچ رہا تھا۔ سکندر نے گاڑی کے پیچھے سے نکل کر صحافی پر چھلانگ لگائی۔ اس کے ساتھ ہی زمین پر گر کر اس سے لپٹ کر دور لڑھکتا چلا گیا۔

ان لمحات میں دو سمتوں سے گولیاں چل رہی تھیں۔ اس نے زمین پر سے اٹھ کر مجیدا.......... کی طرف گولی چلائی۔ وہ ناکامی کے بعد بھاگ رہا تھا۔ اس کی دوسری ٹانگ میں گولی لگی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ پاشا نے فرار ہوتے وقت سکندر کا نشانہ لیا۔ ٹریگر کو دبایا۔

گولی آکر سکندر کے سینے میں لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرا۔ دوسری طرف سے مجیدا نے گولی چلائی۔ وہ گولی اس کی پشت پر لگی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔

غزل چیخ رہی تھی۔ "سکندر! یہ آپ کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ میں فائرنگ کی آوازیں سن رہی ہوں۔ آپ وہاں سے بھاگ جائیں۔"

اس کے قریب بیٹھے ہوئے نواب صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں بھی فون کے ذریعے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ موبائل کے اور قریب ہو کر سننے لگے۔

سکندر اپنی آخری تمام سانسوں کو سمیٹ کر زمین پر پڑے ہوئے فون پر جھک کر کہہ رہا تھا۔ "آہ! یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔ میری جان! یہ موت سچی ہے۔ اس بار تم میری میت بھی دیکھو گی اور میری قبر بھی۔ اپنے نامراد عاشق کی آخری خواہش پوری کرو۔ میری قبر پر آکر بدنامی کو ہوا نہ دینا۔ اللہ تعالیٰ نے جو عزت دی ہے' اسے سنبھال کر رکھنا............ ہا"

آخر میں۔ "ہا" ایسے سنائی دی جیسے اندر کی آخری سانس باہر چھوڑ رہا ہو۔ غزل اٹھ کھڑی ہو گئی۔ چیخ چیخ کر اسے آوازیں دینے لگی' لیکن دوسری طرف ابدی خاموشی تھی۔ موبائل فون آن تھا مگر وہ بولنے والا قیامت تک کے لئے چپ ہو گیا تھا۔

غزل کے ہاتھ سے موبائل فون گر پڑا۔ وہ چکرا کر فرش پر بیٹھ گئی۔

زندگی ایک نہ ختم ہونے والی طویل رات بن گئی تھی۔ یہ رات اسے ڈستی آرہی تھی اور آئندہ ڈستی رہے گی۔ بوڑھے نواب صاحب اس رات کی صبح تھے۔ بجھے بجھے سے تھے۔ روشن نہیں تھے۔ داغ داغ اجالا تھا۔ شب گزیدہ سحر تھے۔

ایسے میں زندگی کو جھیلنا ہی پڑتا ہے۔

☆======ختم شد======☆